فہرست مضامین

	تعارف	5
(۱)	مغربی فکر اور اسلامی فکر مختصر موازنہ	8
(۲)	جدید انسان کا داخلی بحران اور اس سے نکلنے کی صورت	
(۳)	افراد معاشرہ اور ریاست کی اصلاح کی صورت کیا ہو؟ ایک مکتوب کے جواب میں اہم مباحث	19
(۴)	ملت کا تہذیبی وتربیتی نظام اس کی خصوصیات اور ہمارے لئے بچاؤ کی صورت	42
(۵)	ہماری سیاست ومعاشرت داخلی بحران کی زد میں	46
(۶)	اللہ کی محبت اور زندگی پر پڑنے والے اس کے اثرات	50
(۷)	زندگی۔ مادی خوشحالی اور صاحبان دل اہم تجزیہ	55
(۸)	پاکستانی ملت کی حالت زار اور ذکر کے اہتمام سے اس کے تدارک کی صورت	59
(۹)	تنقیدی نفسیات اور معاشرے پر اس کے اثرات ونتائج	64
(۱۰)	تصوف اس کی حقیقت اور اہمیت	78
(۱۱)	اللہ کے طالب کے لئے صحیح فکری خطوط	85
(۱۲)	اہل تصوف کے بعض اہم اصول اکابر بزرگوں کے کردار اور تعلیمات کی روشنی میں	99
(۱۳)	وہم کی بڑھتی ہوئی بیماری اور اس سے بچاؤ کی تدابیر	103
(۱۴)	ڈپریشن کا بڑھتا ہوا مرض علاج وتدابیر	111
(۱۵)	سالک کے حالات (راہ سلوک میں چلنے والوں کے لئے)	127
(۱۶)	نفس دوسرے کو آگے بڑھتے ہوئے دیکھنے کا روادار نہیں	133

تعارف

زیرنظر کتاب ''بیداری'' میں شائع ہونے والے میرے مضامین کے مجموعہ پر مشتمل ہے۔ یہ مضامین جدید انسان کے اس داخلی بحران سے تعلق رکھتے ہیں، جو مادی تہذیب پر فریفتگی، نفسی قوتوں کی پرستش، دل اور روح کو اس کی مطلوبہ غذا نہ دینے اور فطرت سلیمہ میں موجود، خیر کی قوتوں کو پامال کرنے کے نتیجہ میں پیدا ہوا ہے، اس بحران نے عالمی سطح سے لے کر محلّہ اور دیہات کی سطح تک افراد کو گھیر لیا ہے، اس کی وجہ سے معاشرہ میں افراتفری، نفسانفسی، ایک دوسرے پر بالادستی حاصل کرنے کی کوششیں، مادی رجحانات کے غلبہ، بگاڑ، اداسی، بے یقینی اور دنیا پر ٹوٹ پڑنے کے میلانات فروغ پذیر ہوئے ہیں اور نفسیاتی بیماریوں کی ایک وبا پھیل چکی ہے۔

زیرنظر مضامین میں افراد معاشرہ میں پیدا شدہ اس بحران کا تجزیہ کرکے بتایا گیا ہے کہ انسان اشرف المخلوقات ہے، اللہ نے اسے اپنا خلیفہ بنایا ہے اور ساری کائنات اس کے لئے مسخر کردی ہے۔ یہ خلیفہ اگر اپنی اصلیت کو پہنچان کر، اپنی صحیح ذمہ داریاں ادا نہ کرے گا تو اس کی سزا کے طور پر اس کی زندگی عذاب بن جائے گی اور اس سے دلی سکون کی نعمت عظمیٰ سلب کردی جائے گی۔

کتاب میں ایک مضمون افراد معاشرہ اور ریاست کی اصلاح کیسے ہو؟ کے عنوان سے ہے۔ اس مضمون میں اس غلط فہمی کو دور کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ صدیوں سے موجود ہمارا تربیتی نظام اب فرسودہ اور ناکارہ ہوچکا ہے، اس لئے اب ہمیں ریاستی نظام کی اصلاح کے لئے مغرب کے عملی تجربات سے ہی استفادہ کرنا ہوگا، الحمدللہ زیرنظر مضمون میں اس سلسلہ میں ذہنوں میں موجود اشکالات کو دور کرکے اپنے تہذیبی اداروں اور ملت کے مسلمہ تربیتی سلسلوں پر اعتماد بحال کرنے کی مؤثر کوشش ہوئی ہے۔ اس طرح یہ مضمون ایک لحاظ سے مغرب کے مادہ پرستی پر مبنی اخلاقی وتربیتی نظام اور مسلم امت کے صدیوں کے تربیت کے اخلاقی وروحانی نظام کے تقابلی مطالعہ کا بھی ذریعہ بن گیا ہے۔ یہ مضمون بالخصوص مغربی فکر سے متاثر جدید طبقات کے لئے مفید ثابت ہوگا۔

کتاب میں ایک مضمون ''تنقیدی نفسیات اور معاشرہ پر اس کے اثرات'' کے عنوان سے بھی ہے، اس میں بتایا گیا ہے کہ نفس کی قابل ذکر اصلاح سے پہلے اہل علم واہل دانش جب دوسروں کی اصلاح کے مقام پر فائز ہوکر، کام کرنے لگتے ہیں تو نفس پرستی کی قوتوں کی نزاکتوں کو نہ سمجھنے کی وجہ سے انہیں اپنی ذات کے عیوب بالکل نظر نہیں آتے، جب کہ انہیں معاصر شخصیتوں میں خامیاں ہی خامیاں نظر آتی ہیں، یہ نفس کا بہت بڑا فریب ہوتا ہے، جو عام طور پر اہل علم واہل دانش اور باصلاحیت افراد میں پیدا ہوجاتا ہے۔ تنقیدی نفسیات کے غلبہ کی وجہ سے ہی معاشرہ میں انتشار، تفریق، ٹوٹ پھوٹ، ایک دوسرے سے دوری وکدورت، امت میں تفریق اور دوسروں کو اپنی شخصیت کے بت سامنے جھکانے جیسے مفاسد پیدا ہوتے ہیں۔

''تصوف کی حقیقت اور اس کی اہمیت، کے عنوان سے مختصر مضمون میں بتایا گیا ہے کہ تصوف، اسلامی شریعت کی روح پر عمل کرنے، مادیت پرست اور نفس پرست قوتوں کے مقابلہ میں حساسیت پیدا ہونے، ہر سنت پر عمل پیرا ہونے کی استعداد پیدا ہونے، باطل (وہ چاہے خارجی صورت میں ہو یا داخلی صورت میں، اس) سے نفرت وبیزاری پیدا ہونے کا ذریعہ ہے۔

موجودہ دور میں تصوف میں جو خرابیاں پیدا ہوگئی ہیں، وہ ایک تو تصوف کے درگاہی صورت اختیار کرنے کی وجہ سے ہوئی ہیں کہ صاحبزدگان جو اہل ہوں یا نہ ہوں، وہ ہر صورت میں بزرگی کو اپنی میراث سمجھتے ہیں اور اپنے باپ دادا کے مریدوں کے خاندانوں کو اپنی وراثت کا حصہ سمجھتے ہیں۔

تصوف میں پیدا ہونے والی خرابیوں کا دوسرا بڑا سبب قابل ذکر حدتک نفس کی اصلاح سے پہلے افراد کو خلافت کے مقام پر فائز کرنے کی عمومی روش ہے، جو اس دور کے متعدد مشہور بزرگوں نے شروع کی ہے۔ اس کا ایک بڑا نقصان یہ ہورہا ہے کہ ایسے افراد میں عاجزی، فنائیت اور زہد وفقر کی صفات پیدا نہیں ہوپاتی۔ نیز وہ اپنے آپ کو رہبر شریعت اور پیرطریقت سمجھکر، حقیقی تصوف کی بدنامی کا ذریعہ بن رہے ہیں۔ خلافت کی اس عمومی تقسیم کی روش سے جو دوسرا بڑا نقصان ہورہا ہے، وہ یہ ہے کہ اس طرح کی شخصیتیں آخر وقت تک اپنی ذاتی اصلاح کی طرف آنے کے لئے تیار نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ

بزرگی کا دعویٰ انہیں بڑے پن کے مرض میں مبتلا کرنے کا ذریعہ بنتا ہے، اس کا تیسرا نقصان یہ ہورہا ہے کہ تصوف کے نام پر دنیاداری اور دکانداری والی روش عام ہونے کی وجہ سے اہل تصوف کی ہوا کھڑ رہی ہے۔ لوگ اسی کو حقیقی تصوف سمجھکر، حقیقی اہل تصوف (جو فنائیت اور زہد وفقر کے صاحب ہیں) ان سے باغی ہورہے ہیں۔

کتاب میں افراد معاشرہ میں بڑھتی ہوئی ڈپریشن کی بیماری اور اس کے حل کے موضوع پر بھی بحث کی گئی ہے۔ ڈپریشن دراصل جدید دور کی مادہ پرستی اور نفس پرستی پر مبنی طرز زندگی کا لازمی نتیجہ ہے۔ اللہ محبوب جو انسان کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے، اس سے تعلق منقطع کرنے اور ہر وقت دنیا ودولت کے دیو کو سوار کرنے کی یہی سزا مل سکتی ہے کہ فرد وافراد بے بسی، بے گانگی، بے چارگی اور مایوسی کی مکمل تصویر بن کر رہ جاتے ہیں اور زندگی کے دوراہے پر حیران وپریشان کھڑے رہتے ہیں۔ ایک مسلمان، جو اللہ کی ذات پر یقین کامل رکھتا ہو، جسے زندگی کے ہر موڑ پر یہ احساس ہو کہ میرا مولا میرے ساتھ ہے، وہ ڈپریشن اور ذہنی دباؤ کا ہرگز شکار نہیں ہوسکتا۔ اس موضوع پر لکھے گئے مضامین میں سیر حاصل بحث کرکے، یہ نکتہ سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اللہ کے ذکر میں وہ توانائی، وہ نور وحسن موجود ہے کہ جب اس نور کی کرنیں، دل، دماغ اور نفسیات پر پڑنے لگتی ہیں تو وہ خوشی اور وحلاوت کے احساسات سے سرشار ہوجاتے ہیں۔

جدید نفسیاتی ماہرین نے اس بیماری کے علاج کے لئے جو مشقیں تجویز کی ہیں، وہ خالص مادی نوعیت کی مشقیں ہیں، جو اللہ پر یقین نہ رکھنے والے مادہ پرست مغربی انسان کے لئے نفسیاتی حربوں کی حیثیت رکھتی ہیں، جب کہ مسلمان کی حیثیت سے اس طرح کی مشقیں ہمارے مسئلہ کا حل ہرگز نہیں۔

ہمارا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ ہماری ملت کی سیاسی، انتظامی اور تعلیمی قیادت ایسے افراد پر مشتمل ہے، جو اپنی تہذیب سے ناآشنا ہے اور مادہ پرست مغربی تہذیب سے بُری طرح مرعوب ہے۔ اس قیادت نے مغرب کے مادہ پرست انسان کی تقلید میں ہمارے ہاں بھی عملی طور پر سیکولر اور مادہ پرستی پر مبنی نظام مسلط کر دیا ہے۔

اس کا نتیجہ ہے کہ ہماری جدید نسلیں تیزی سے مغرب کی طرح مادہ پرستی کی سوچ کی حامل ہورہی ہیں۔ اس کی وجہ سے وہ خدا اور دین سے دور ہوکر دنیا وآخرت کے خسارہ سے دوچار ہورہی ہیں۔

صحیح قیادت ہماری سب سے اہم ضرورت ہے۔ اپنی تہذیب سے ہمہ آہنگ قیادت کے بغیر ہمارا معاشرہ مادہ پرست تہذیب کی یلغار سے زیر وزبر ہوتا رہے گا اور ہماری زندگی کا ہر شعبہ تباہی کا منظر پیش کرتا رہے گا۔

سیاسی وانتظامی وتعلیمی قیادت میں تبدیلی کی بہتر صورت یہی ہے کہ ہماری مذہبی، دینی اور روحانی قیادت پوری طرح اپنی ذمہ داریاں محسوس کرے۔ وہ عوام اور اپنے درمیاں موجود خلا کو ختم کرے اور عام لوگوں سے ذاتی نوعیت کے رابطہ کا خصوصی اہتمام کرے ضروری ہے کہ ہماری مذہبی وروحانی قیادت کے دروازے ہر فرد کے لئے کھلے ہوں۔ ان کا دل ہر کلمہ گو مسلمان کے لئے کشادہ ہو، ان کی تحریر وتقریر وگفتگو میں محبت، شفقت واپنائیت کا پہلو غالب ہو، انہیں سایہ دار درخت کی طرح ہونا چاہئے، جو ہر ایک کے لئے گرمی سے تپش کا ذریعہ بنتا ہے۔ سمندر میں جزیزہ بن کر رہنے کا نتیجہ یہی نکل سکتا ہے، جو اس وقت نکلا ہے کہ جدید نسلیں اہل مذہب سے دور سے دورتر ہورہی ہیں۔

دوسری چیز جس کی سخت ضرورت ہے، وہ یہ ہے کہ ہماری مذہبی، دینی وروحانی قیادت جدید دور کی پیدا کردہ ذہنی وعلمی سطح سے ہمہ آہنگ ہو، تاکہ نئی نسل سے ان کی زبان اور ان کے اسلوب میں ان سے گفتگو ہو سکے، آج جب کہ انٹرنیٹ نے علم کا خزانہ کھول دیا ہے، اس طرح کی صورتحال میں یہ امید رکھنا کہ جدید نسلوں کو روایتی وعظ ونصیحت کے ذریعہ مطمئن کیا جا سکے گا، سادہ لوحی ہے۔ جدید نسلیں سیکولرزم اور عقلیت پسندی کے پس منظر میں اسلام کو سمجھنا چاہتی ہیں۔ اس کے لئے ہمارے علماء کرام کو اپنی علمی وذہنی سطح کو بلند کرنا پڑے گا۔ دور جدید کی ذہنی سطح کو سمجھے بغیر جدید طبقات کو دین پر مطمئن کرنا اور خدمت دین کا بہتر طور پر فریضہ سرانجام دینا مشکل تر ہے۔

مغربی فکر اور اسلامی فکر

مختصر موازنہ

مغربی فکر (جو اس وقت عالمگیر صورت اختیار کر چکا ہے) اس کا مرکزی ہدف دنیاوی کیریئر بنانا ہے اور مادی زندگی کو زیادہ سے زیادہ خوشحال اور لذیذ سے لذیذ تر بنانا ہے نیز فرد وافراد کو اس قابل بنانا ہے کہ وہ اپنی صلاحیتوں وتوانائیوں کے ذریعہ معاشرے وریاست کو مادی طور پر مستحکم کرے۔

مغربی فکر کا یہ ہدف دراصل انسان، کائنات اور تخلیق کائنات کے بارے میں ان کے خالص مادی نقطہ نگاہ ہی کا نتیجہ ہے، جس کے تحت انسان وکائنات کی تخلیق اللہ کی منصوبہ بندی وحکمت کے تحت نہیں ہوئی ہے، بلکہ ارتقا کے قدرتی قوانین کی صورت ہے۔ انسان تو بس حیوان ہی کی ترقی یافتہ صورت ہے۔ اس میں جتنے بھی جذبات واحساسات اور تقاضے پائے جاتے ہیں، وہ سب کے سب خالص مادی نوعیت کے ہیں، روح ودل کی جوہری قوت اور فطرت سلیمہ جیسی چیزیں سرے سے انسان میں موجود ہی نہیں ہیں، وہ سراسر نفسانی خواہشات کا مجموعہ ہے۔ یہ زندگی سراپا مادی مسرت کے حصول ہی کا ذریعہ ہے۔ موت کے بعد کی زندگی مذہب کا واہمہ ہے۔

مغربی فکر اور اس کی تہذیب دراصل انسان وتخلیق کائنات کے بارے میں ان کے اسی مادی نقطہ نظر ہی کا مظہر ہے۔

اسی نقطہ نگاہ کے غلبہ کے نتیجہ میں ہی وہ نظام تمدن وتہذیب وجود میں آیا ہے جس نے پوری انسانیت کو مادیت پرستی کی آگ میں جھونک دیا ہے۔ انسانی روح کو تھکا دیا ہے، دل کو اس کی اصل غذا سے محروم کردیا ہے، اور دماغ کو خالص مادی سوچ کے ذریعہ فکری انتشار کا شکار بنادیا ہے۔

مغربی (جدید) نفسیات کا کام یہ ہے کہ غیر معمولی مادی جدوجہد یعنی مادہ کی بہت زیادہ پرستش کے نتیجہ میں فرد جب نفسیاتی اور اعصابی بیماریوں کا شکار ہوجائے تو اسے ارتکاز قوت کی مادی نوعیت کی کچھ مشقوں یا نشہ آور گولیوں کے ذریعہ وقتی طور پر آرام پہنچایا جائے یا اس کے ذہن کو منجمد کردیا جائے، تاکہ وہ کچھ ہفتوں یا کچھ مہینوں تک مادہ کی پرستش یعنی غیر معمولی مادی جدوجہد سے آزاد ہو سکے، اس سلسلہ میں جدید نفسیات فرد کی وقتی تسلی سے زیادہ تسکین کا انتظام کرنے سے بالکل قاصر ہے۔

جب کہ اسلامی فکر وتعلیمات کا ہدف یہ ہے کہ دنیاوی ضروریات کے حصول کی جدوجہد کے باوجود دنیا میں استغراق کی حالت پیدا نہ ہو اور محبوب حقیقی یعنی اللہ سے غفلت پیدا نہ ہو، نیز فرد اخلاقی اور روحانی طور پر اتنا مستحکم ہو کہ اللہ کی محبت ورضا اور اس کی اطاعت اس کا مقصود ہوجائے۔ اللہ کے لئے جینا ومرنا اس کا ہدف بن جائے۔ اللہ کی محبت کے زیر اثر وہ معاشرہ وریاست کو اسلامی نقطہ نگاہ سے مستحکم کرنے کا کردار ادا کرے اور تعمیر سیرت کے ذریعہ اللہ کے بندوں سے محبت، ان کی خدمت، انسانی جوہروں سے بہرہ وری اور آخرت میں نجات، یہ ساری چیزیں اس کے مزاج کا حصہ بن جائیں۔

مسلم نفسیات (یعنی اہل تصوف) کا کام یہ ہے کہ فرد کے دل، روح اور نفسیات کو صحبت صالحہ کے نورانی ماحول اور اللہ کے ذکر سے اتنا مستحکم کیا جائے کہ دل، عقل اور نفسیات کا توازن بگڑنے نہ پائے۔ اور ذکر کے ذریعے ان کی تسکین وتشفی کا ایسا انتظام ہو

کہ وہ حلاوت سے سرشار ہوجائیں اور فرد اور افراد تخلقوا بااخلاق اللہ کے حامل ہوجائیں۔

مغربی فکر اور اسلامی فکر کے درمیاں یہ فیصلہ کن اور بنیادی فرق ہے، جو دونوں کو ایک دوسرے سے جدا کرتا ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ یہ جوہری نوعیت کا فرق ہے اور دنیا میں جہنمی منظر اور جنتی منظر کے مماثل ہے۔

ہم نے مغربی فکر کی تقلید اختیا کرنے اور اور مغربی تہذیب پر فریفتگی کی وجہ سے اسلامی ناموں سے موسوم ہونے اور بعض اسلامی روایات پر عمل پیرا ہونے کے باوجود عملاً، اپنے لئے جو مظاہر زندگی اور طرز زندگی پسند کی ہے، وہ مغرب کی مادیت پرستی پر مشتمل زندگی ہے اور دنیاوی کیریئر کو مقصود بنانے والی زندگی ہے، اس کے جو نتائج نکل سکتے ہیں، وہ اہل مغرب کی انفرادی واجتماعی کی زندگی میں ظاہر ہونے والے نتائج کے علاوہ دوسرے نکل سکیں، ممکن ہی نہیں۔ یعنی مادی زندگی ہی کو مسرت کا واحد ذریعہ سمجھنا، ایک دوسرے پر فوقیت حاصل کرنے کو زندگی کے مقاصد میں شمار کرنا، رحم دلی، ہمدردی، محبت، شفقت اور حقیقی انسانیت نوازی جیسے اوصاف سے محرومی اور بڑھتے ہوئے نفسیاتی امراض کا شکار ہونا وغیرہ وغیرہ۔

قرآن نے یہ اہم نکتہ واضح فرمادیا ہے کہ ظالم قوموں کی طرف جھکنے کے نتیجہ میں آگ کی لپیٹ سے بچنا ممکن نہیں (**ولاترکنوا الی الذین ظلموا فتمسکم النار۔**)

ظالم اور مادہ پرست قوموں کے مظاہر زندگی اور طرز زندگی سے نفرت کی بجائے ان سے دل بستگی اور ان پر فریفتگی کا لازمی نتیجہ دل، روح اور نفسیات کا آگ کی لپیٹ میں آجانا ہے۔ جہنم کی آگ سے پہلے اس دنیا میں بھی یہ آگ چھوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔

ہمارے ہاں بڑھتی ہوئی نفساتی بیماریاں، سنگ دلی، قساوت قلبی، دولت پر سانپ بن کر رہنے کی نفسیات، مال کی خاطر قوم وملت اور عزیز واقارب کو پامال کرنا وغیرہ یہ ساری چیزیں مغربی فکر کا منطقی نتیجہ ہیں۔ سنبھلنے کی ضرورت ہے۔

جدید انسان کا داخلی بحران

اور اس سے نکلنے کی صورت

(۱)

عصر حاضر کی مشینری زندگی نے لگ بھگ ہر فرد کو نت نئے بحرانوں سے دوچار کر دیا ہے، جس سے انسانی زندگی بہت سارے خطرات سے دوچار ہوگئی ہے۔ ان بحرانوں میں محبوب حقیقی اور مخلوق سے محبت نہ ہونے کا بحران، خود اعتمادی کا بحران، دولت پر لپکنے کا بحران، عاجزی وانکساری سے محرومی کا بحران، دوسروں کی تحقیر اور ان پر بالادستی کے احساسات کا بحران، انسانیت کی قیمت پر مفادات کے حصول کا بحران، شہرت ونام وری کے حصول کی تگ ودو کا بحران، دنیا کی خوبصورتی پر فداکاری کا بحران، اشتعال، جھنجھلاہٹ کا بحران، مزاج کے خلاف باتوں کی عدم برداشت کا بحران، رشتۂ وفاداری کے تقدس کے خاتمہ کا بحران، اپنے بھائیوں کے خلاف نفرت، کدورت، اور ان سے انتقام لینے کے جذبات کا بحران، سیاست، معاشرت، معیشت اور مذہبی زندگی میں ایک دوسرے کو برداشت نہ کرنے کا بحران، دین ومذہب اور روحانیت کے نام پر ناموری ودولت کے حصول کا بحران، غرض کہ محلوں، قوموں اور ملکوں کی سطح سے لے کر عالمی سطح تک انسانیت اس طرح کے بے شمار بحرانوں سے دوچار ہے، اس کی وجہ سے معاشرہ تصادم، خلفشار اور مفاسد سے دوچار ہے اور انسانیت سکھ، سکون، امن وغیرہ سے محروم ہوچکی ہے۔

ان بحرانوں کا جائزہ لیں گے تو معلوم ہوگا کہ یہ سارے بحران داخل میں موجود ایک زبردست خلا کے نتیجہ میں ہی پیدا ہوئے ہیں۔ داخل میں موجود یہ خلا ایسا ہے، جو کسی طور پُر ہونے نہیں پاتا، بدقسمتی کی بات یہ ہے کہ انسانیت، باطن میں موجود اس ہولناک خلا کے ادراک سے قاصر ہوگئی ہے، سبب یہ ہے کہ اعمال بد کی صورت میں فطرت سلیمہ کے منافی اعمال مزین کرکے دکھائے دیتے ہیں۔ اور فرد وافراد انسانیت کے منافی ان اعمال کو اپنے خصوصیات وکارنامے تصور کرنے لگتا ہے۔ چونکہ ہمارا سارا تعلیمی وتربیتی نظام، میڈیا وابلاغ (اور سارے جدید نظریات اور ان نظریات کے زیر اثر وجود میں آنے والی مادہ پرستی پر مبنی تہذیب) داخل میں موجود اس ہولناک بحران کے شعور پیدا کرنے سے انکار پر مشتمل ہے، اس لئے انسانیت، تاریخ میں پہلی بار عالمگیر سطح پر ہولناک بحرانوں سے دوچار ہوکر، قابل رحم حالت تک پہنچ چکی ہے۔

داخل میں موجود یہ بحران کیا ہے، جس سے دوسرے سارے بحران پیدا ہوئے ہیں؟ یہ بحران دراصل اپنی شخصیت کی اصلیت اور حقیقت سے ناآشنائی کا بحران ہے۔

انسانی شخصیت کی تخلیق، محبوب حقیقی سے محبت کے ایسے جذبات وداعیے کے ساتھ ہوئی ہے کہ شخصیت کو حقیقی محبوب سے محبت سے سرشار کئے بغیر، اس کے سارے جذبات واحساسات مفاسد سے بھرپور ہوجاتے ہیں۔ توحید کا عقیدہ اور اللہ سے والہانہ محبت کا داعیہ انسانی فطرت کا ناگزیر بلکہ سب سے طاقتور داعیہ ہے۔

شخصیت میں توحید پرستی کا یہ عقیدہ اتنا راسخ ہے کہ مادہ پرستی کی ساری فضا کے باوجود فرد وافراد جب موت کے سے مسائل سے دوچار ہوتے ہیں تو وہ سارے بتوں اور سارے خداؤں کی نفی کرکے اپنے حقیقی مولیٰ کو پکارنے لگتے ہیں قرآن نے انسان کے ان فطری احساسات کی ترجمانی بہتر طور پر کی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسانی شخصیت عقیدہ توحید کے رسوخ واستحکام کے بغیر داخلی وخارجی بحرانوں سے بچ سکے اور خوداعتمادی سے سرشار ہوکر، انسانیت کے شایان شانِ زندگی گذارنے کے اہل ہو سکے، ممکن ہی نہیں۔ اللہ نے فطرت میں موجودہ عقیدہ توحید کے سبق کی یاد دہانی اور پختگی کے لئے انبیاء کرام بھی بھیجے، آخری رسول کی تعلیم بھی عقیدہ توحید کے استحکام ہی کی تعلیم ہے۔

عقیدہ توحید اپنے ساتھ اللہ سے والہانہ محبت کے ایسے جذبات سامنے لاتی ہے، جس کے نتیجہ میں دوسرے سارے مادی اور نفسیانی جذبات، عقیدہ توحید کے تابع ہوجاتے ہیں۔

عقیدہ توحید محض اللہ کے ایک ہونے کے زبانی اقرار کا نام نہیں ہے، بلکہ اس عقیدہ کو دل ودماغ، نفسیات اور انسانی شخصیت کی گہرائیوں میں راسخ کرنا ہے، اس عقیدہ توحید کے نتیجہ میں شخصیت میں موجود سارے بحرانوں کا خاتمہ ہونے لگتا ہے اور انسانی شخصیت

سکون وسکینت سے بہرہ ہونے لگتی ہے اور وہ اپنے محبوب کے بیجھی ہوئی تعلیمات پر صدق دلی سے عمل پیرا ہونے کو اپنی سعادت سمجھنے لگتی ہے۔

عقیدہ توحید اپنے ساتھ وہ ساری خصوصیات وخوبیاں لانے کا ذریعہ بنتی ہے، جو انسان کا جوہر ہے، اور جو فطرت سلیمہ کا حصہ ہیں اور جو سارے انبیاء کی تعلیمات کا حاصل ہیں۔

آج کا ہمارا سارا بحران اسی عقیدہ توحید کو مستحکم نہ کرنے، تعلیمی وتربیتی اداروں کے ذریعہ عقیدہ توحید کو غالب نہ کرنے اور اس کے لئے خصوصی اہتمام نہ کرنے ہی کا نتیجہ ہے، عقیدہ توحید، اللہ کے ساتھ والہانہ محبت وعشق کے بغیر مستحکم ہوسکے، ممکن نہیں۔ اللہ کا یہ عشق ہی ایسی چیز ہے، جو مادیت پرستی ونفس پرستی کے بتوں کو قلع قمع کرکے، شخصیت میں انسانی جوہروں کو اجاگر کرتا ہے اور فرد کو محض اللہ کے لئے جینے اور اللہ کے لئے مرنے کے مزاج ونفسیات کا حامل بناتا ہے۔

عقیدہ توحید کلمہ طیب کے تقاضوں کو مستحکم کرنے، اللہ کے علاوہ سارے باطل معبودوں کی عبادت سے انکار کرنے اور اللہ سے والہانہ محبت کی بنیادوں پر فرد وافراد کی تعمیر سیرت کرنے کا ذریعہ ہے۔

عصر حاضر کے سارے علوم وفنون اور تعلیمی وتربیتی اداروں میں سب سے زیادہ غفلت جس کام سے برتی جارہی ہے، وہ عقیدہ توحید کے رسوخ کا کام ہے، بلکہ جدید تعلیمی اداروں اور جدید تعلیم کی فلسفیانہ بنیادوں سے خدا کے تصور ہی کو نکال دیا گیا ہے، جو دراصل انسانی فطرت کے ساتھ جنگ کرنے کے مترادف ہیں۔ جو قومیں انسانی فطرت کے ساتھ جنگ کی راہ پر گامزن ہوں، ان قوموں کے افراد بے شمار ذہنی، نفسیاتی، اخلاقی وروحانی بیماریوں سے بچ صحیح طور پر انسانی حیثیت سے زندگی گذرنے کے قابل ہوسکیں، ممکن ہی نہیں۔

مادہ پرست مغربی تہذیب نے انسان سے عقیدہ توحید سلب کرکے، انسانیت کو عالمگیر بحران سے دوچار کردیا ہے، افراد کا افراد سے ٹکراؤ، قوموں کا قوموں سے ٹکراؤ، ملکوں کا ملکوں سے ٹکراؤ، ایک دوسرے کو مارنے اور فنا کرنے کے لئے ہتھیاروں کی دوڑ، دولت کی خاطر انسانوں کی پامالی وتباہی، عورت کو عریاں کرکے زندگی کے ہر موڑ پر لاکھڑا کرنا، انسانیت پر جنس کے جنوں کو سوار کرنا وغیرہ یہ ساری چیزیں ایسی ہیں، جو انسانیت کی تباہی کا پیشہ خیمہ ہیں۔ اس سے انسان جتنے بھی نت نئے بحرانوں سے دوچار ہو، کم ہے۔

(۲)

جدید انسان کی زندگی میں پیدا شدہ یہ خلا اور بحران عقل وعقلیت کے استعمال کے ذریعہ حل نہیں ہوسکتا۔ اگر حل ہوتا تو اب تک اس کے حل ہونے کی صورتیں پیدا ہوچکی ہوتی۔ اس لئے کہ مغرب کے ماہرین نفسیات اور ماہرین طبعیات اس مسئلہ کے حل کے لئے اپنی بہترین ذہنی صلاحیتیں صرف کرچکے ہیں، ہمارے وہ دانشور، جو عقل کے بھرپور استعمال کے علمبردار ہیں، وہ بھی اپنی ساری کوششوں کے باوجود اس معاملہ میں پیش قدمی کرنے سے قاصر ہیں۔

عقل کی اہمیت سے انکار نہیں، لیکن عقل، مادی تحقیق کے اعتبار سے تو غیر معمولی کردار ادا کرتی ہے، جب کہ وہ انسان کے داخلی بحران کی نوعیت کو سمجھنے اور اس بحران سے نکلنے کے سلسلہ میں صحیح نتائج تک پہنچنے سے قاصر ہے، سبب یہ ہے کہ عقل، خود مادہ کی پیداوار ہے، جب کہ انسان بنیادی طور پر جوہری واقع ہوا ہے اور اس مادی دنیا سے زیادہ دوسری اعلیٰ تر دنیا کا حصہ ہے۔

عقل پر غیر معمولی اعتماد اور سارے جدید علوم کی بنیاد عقل محض پر رکھنے اور عقل محض کی بنیاد پر جملہ انسانی معاملات کو سرانجام دینے کی روش ایسی ہے، جس نے انسانیت کو بند گلی میں لاکھڑا کیا ہے، جہاں سے نکلنے کے سارے راستے مسدود ہیں۔

عقل اور عقلیت کی حدود کو سمجھنے اور عقل سے بلند ہوکر، انسانی شخصیت میں موجود دوسری قوتوں کو بیدار کرنے سے ہی ہم انسانیت کو درپیش اس ہمہ گیر وہمہ جہتی بحران سے نکال سکتے ہیں، اس کی دوسری کوئی صورت موجود نہیں ہے۔

خالق ہستی نے انسان کی تخلیق اس طرح کی ہے کہ اس میں کچھ اپنے جلوے رکھدیئے ہیں، ساتھ ساتھ مادی نفس اور عقل کی قوت بھی رکھی ہیں۔ ان جلووں کو آپ روح اور دل کے نام سے موسوم کرلیں، یہ مذہبی اصلاحات ہیں، سارے انبیاء کرام نے

خالق کائنات کی رہنمائی میں انسانی شخصیت کی توجیہ یہی کی ہے کہ روح اور دل کی قوتیں انسانی شخصیت میں اصل اور فیصلہ کن حیثیت کی حامل ہیں۔

شخصیت میں موجود ان دونوں قوتوں کی اصلیت اور ان کے تقاضوں کو سمجھکر، ان کی تسکین کے عدم اہتمام سے ہی وہ سارے مسائل اور وہ سارا بحران پیدا ہوتا ہے، جس سے اس وقت انسانیت دوچار ہے۔ مسلم امت جو دوسروں کی رہنمائی کے لئے پیدا ہوئی ہے، کتنی بدقسمتی کی بات ہے کہ وہ امت خود اس سلسلہ میں مادہ پرست مغرب انسان سے رہنمائی حاصل کرنے کے لئے رجوع کر رہی ہے۔ اور اپنے جملہ مسائل کے حل کے لئے انہی کے نسخہ جات کو استعمال کرنے میں فخر محسوس کر رہی ہے۔

(۳)

داخلی بحران میں اضافہ کرنے والے جو عوامل موجود ہیں، وہ اگرچہ بہت زیادہ ہیں۔ لیکن کچھ اہم عوامل کی نشاندہی کی جاتی ہے۔

- سیکولرزم اور عقلیت پسندی پر مبنی عالمی نظام کو اپنے ہاں عملا نافذ کرنا اور انہی خطوط پر اپنے نظام تعلیم اور اجتماعی زندگی کی تشکیل کرنا اور اس سلسلہ میں اہل مغرب کی رہنمائی کو حرف آخر سمجھنے کی روش کا ہونا۔

اسی روش کا نتیجہ ہے کہ ساری حکومتی مشنری اور ریاستی نظام سے وابستہ افراد کا آئیڈل، عقلیت پسندی کا مغربی نظام ہی بن گیا ہے۔

- اہل مغرب نے صدیوں سے غور وفکر کے نتیجہ میں مادی زندگی اور سیاسی نظام کو بہتر بنانے کے لئے جو بہتر اصول اختیار کئے، انہیں اپنے نظام تعلیم وتربیت کا حصہ نہ بنانا، ان کے ان بہتر اصولوں کو اختیار نہ کرنا، جب کہ ان کے ہاں موجود ساری خرابیوں کو اپنانے کے لئے مجنوں وار ہونا، ہمارے حکمرانوں، سیاستدانوں اور سول وفوجی بیوروکریسی کی اس روش نے پاکستانی ملت کو المناک صورتحال سے دوچار کردیا ہے اور داخلی بحرانوں کے ساتھ بہت سارے خارجی بحرانوں میں بھی مبتلا کردیا ہے۔
- غلط نظام تعلیم جس کے تحت فطرت سلیمہ کے اجزاء، روحانیت اور دل کی سلامتی کو دبا کر نفسی قوتوں اور مادیت پرستی کے جذبات کو ابھارا اور فروغ دیا جارہا ہے۔ اور جو مادہ پرستی کی قوت کو غالب کرنے کا موجب بن رہا ہے۔
- ہمارے سیاسی نظام کا نیم سرمایہ دارانہ اور نیم جاگیردارانہ بنیادوں پر استوار ہونا اور اس کی پیدا کردہ خرابیوں نے بھی افراد معاشرہ کے داخلی بحران میں اضافہ کیا ہے، ہمارا یہ سیاسی نظام خدمت، دیانتداری، صلاحیت، اصولوں اور خیر وصداقت سے سراسر عاری ہے، اور سیاست سے وابستہ خاندانوں کے مفادات پر مشتمل ہے۔ اس سیاسی نظام نے سفارش، رشوت، لوٹ مار، کروڑپتی سے ارب پتی بننے کے جنوں، اور اسلامی سیاست کے اصولوں سے دوری جیسی چیزوں کو فروغ دے کر، لوگوں کے جائز سے جائز کاموں کے بھی راستے مسدود کردیئے ہیں۔ سیاسی نظام کی پیدا کردہ اس تباہ کاری سے مایوسی، ڈپریشن اور داخلی بحران نے جنم لیا ہے۔ بدقسمتی کی بات یہ ہے کہ اس نظام کی درستگی کی کوئی صورت موجود نہیں ہے، بلکہ جو افراد اور جو جماعتیں بھی اس سیاست کا حصہ بن رہی ہیں، وہ سیاسی نظام کی خرابیوں سے آلودہ تر ہوتی جارہی ہیں اور خیر کے وہ اجزاء جو شروع میں ان کے اندر کسی حد تک موجود تھے، سیاست کی آلودگیوں نے ان کے خیر کے ان اجزاء کو بھی کم سے کم تر کرنا شروع کردیا ہے۔

نیم سرمایہ دارانہ ونیم جاگیردارانہ سیاست کی بنیادوں میں ہی ایسی خرابیاں موجود ہیں، جن کی وجہ سے یہ سیاست، قومی زندگی میں بگاڑ اور مفاسد کا ذریعہ بن رہی ہے، شر کی بنیادوں سے خیر کا ظہور ہو، مشکل تر ہے۔ فساد سے بھرپور سیاسی نظام کی تبدیلی کے بغیر نہ تو افراد کے مسائل کے حل کی صورت پیدا ہوسکتی ہے اور ہی ان کا بڑھتا ہوا داخلی بحران کم ہوسکتا ہے، لیکن ظاہر ہے سیاسی نظام کی تبدیلی جیسا بڑا کام افرادِ معاشرہ کی صحتمند بنیادوں پر تبدیلی کے بغیر ممکن نہیں۔

- میڈیا کے سارے طاقتور ذرائع (جو ہر وقت مادیت پرستی کی فضا پیدا کرنے کے لئے کوشاں ہیں) ان ذرائع کو کھلی چھوٹ دینا، اور ان پر کسی طرح کی قدغن کا نہ ہونا، اس کے نتیجہ میں ہر گھر میں مادیت پرستی کے جنوں کی فضا پیدا ہورہی ہے اور مادی حسن پر فداؤں پر اداؤں کا عمل فروغ پذیر ہورہا ہے۔
- معاشی لوٹ مار کا نظام، جس کے تحت روزگار کے جائز ذرائع مسدود سے مسدود تر ہوتے جارہے ہیں۔ جب کہ خاص مراعات یافتہ طبقات کی طرف دولت مرتکز ہورہی

ہے۔ اس ظالمانہ نظام نے روحانیت سے توجہ ہٹا کر، پیٹ کی طرف لوگوں کی توجہ کو مرکوز کرنے اور زندگی کے مادی مسئلہ کو فیصلہ کن اہمیت دینے پر مجبور کیا ہے۔ جب تک ظالمانہ اور لوٹ مار کا یہ نظام موجود رہے گا، شخصیت کے داخلی بحران میں تیزی سے اضافہ ہوتا رہے گا۔

جب یورپ جیسا مادہ پرست معاشرہ اپنے ہاں فلاحی ریاستی نظام تشکیل دے سکتا ہے، جس کے تحت معاشی طور پر پسماندہ افراد کی ضروریات زندگی کی ذمہ دار ریاست ہوتی ہے اور حکومت کی طرف سے اس کا بہتر انتظام ہوتا ہے تو مسلم معاشرہ جس میں حکومت اور خوشحال افراد کی اس ضمن میں دینی ذمہ داریاں بہت زیادہ ہیں، اس معاشرہ میں ایسا نہ ہونے کا کوئی جواز موجود نہیں ہے۔

(۴)

داخلی بحران، دراصل خارجی بحرانوں ہی کا شاخسانہ ہوتے ہیں، یہ ممکن ہی نہیں کہ داخلی بحرانوں کے ہوتے ہوئے خارجی بحرانوں سے بچاؤ کی صورت پیدا ہوسکے، فرد وافراد میں جو کچھ اندر ہوتا ہے، وہی کچھ باہر سامنے آتا ہے، اندر میں اگر دنیا کی محبت ہوگی، مفادات اور خواہشات کا غلبہ ہوگا، انسانیت آزاری کے احساسات ہوں گے تو اس سے خارجی زندگی میں اسی طرح کا منفی کردار ہی سامنے آئے گا۔

اس لئے ضرورت ہے کہ فرد وافراد کی داخلی زندگی کو بدلنے کی جدوجہد ہو اور اس کام کو سارے کاموں پر ترجیح دی جائے، تاکہ بہتر اور پاکیزہ انسان (جو داخلی بحرانوں سے محفوظ ہوں) وجود میں آسکے اور اس سے پاکیزہ معاشرہ متشکل ہوسکے۔

اس کی صورت ایک ہی ہے کہ اپنے نظام تعلیم وتربیت سے کام لے کر افراد کی فطرت سلیمہ میں موجود محبوب حقیقی سے محبت کے جذبات واحساسات کو غالب سے غالب تر کیا جائے اور نفسی قوتوں کی تہذیب کا کام سرانجام دیا جائے۔ اس سلسلہ میں اللہ کی جو سنت رہی ہے، وہ یہ ہے کہ کتاب کی اصولی اور بنیادی تعلیم کے ساتھ ساتھ مثالی وپاکیزہ شخصیتوں کی صحبت کا ماحول فراہم ہو، پاکیزہ صحبت کے ذریعہ فرد کی شخصیت میں جو پاکیزہ جذبات واحساسات پیدا ہوتے اور فروغ پذیر ہوتے ہیں، وہ کسی دوسرے ذریعہ سے ممکن نہیں۔

ہمیں اپنے نظام تعلیم وتربیت میں صالح اور پاکیزہ شخصیتوں کی فراہمی کے کام کو فیصلہ کن اہمیت دینا ہوگی، جو اپنی حرارت اور جذبات محبت سے افراد میں نئی روح پھونک سکیں اور انہیں مادہ پرستی اور نفسی قوتوں سے اوپر اٹھا کر محبوب حقیقی کے لئے انسانی جوہروں سے بہرہ ور زندگی گذارنے کی صلاحیتوں کا حامل بنا سکیں۔

(۵)

اوپر جس داخلی بحران کا ذکر کیا گیا، یہ ایسا بحران ہے، جس میں عالم ہو یا دانشور، دینی جماعتوں سے وابستہ فرد ہو یا عام فرد، کوئی فرد بھی مذکورہ داخلی نوعیت کے بحرانوں سے بچ نہیں سکتا، سوائے ان خوش نصیب افراد کے، جو تزکیہ واحسان کے ذریعہ نفسی قوتوں کو مہذب بنانے کا خصوصی اہتمام کرتے ہوں اور اس کام کو سارے کاموں پر ترجیح دیتے ہوں۔

موجودہ دور میں عالمگیر سطح سے مادہ پرستی کی ایسی آگ بھڑک اٹھی ہے کہ اس آگ سے محض علم وعقل اور وعظ ونصیحت کی باتوں اور رسمی عبادت سے بچنا ممکن نہیں، مادیت پرستی کی اس آگ نے نفس پرستی کی قوتوں کو ہر وقت مشتعل کردیا ہے۔ بالخصوص ذہنی دباؤ اور اشتعال کے جذبات سے بچنے کی کوئی صورت ہی موجود نہیں۔

عالمگیر سطح سے اٹھنے والی یہ آگ دینی جماعتوں، دینی اداروں اور دینی درسگاہوں تک پہنچ چکی ہے۔ علم، عقل، کتاب کی تعلیم اور رسمی دینداری سے بھڑکتی ہوئی اس آگ اور نفسی قوتوں کے استعمال میں کمی کی صورت کا پیدا ہونا دشوار تر ہے۔ ان حالات میں دینی جماعتوں، دینی اداروں اور دینی درسگاہوں کے ذمہ داروں کا اپنے ساتھ وابستہ افراد پر سب سے بڑا احسان یہ ہوگا کہ وہ ان کے تزکیہ کا خصوصی اہتمام فرمائیں، تاکہ نفس کو مہذب بنا کر وہ اپنی ذات اور معاشرہ کے لئے باعث خیر ثابت ہوسکیں۔

اس کی صورت وہی ہے، جس کا ہم نے اوپر ذکر کیا کہ صاحبان تزکیہ وصاحبان دل اور علمائے ربانی سے کسب فیض کا شعور وادراک پیدا ہو اور ساتھ ساتھ اس کی طلب وامنگ بھی۔ اور علمائے ربانی کی دلوں میں محبوب حقیقی سے محبت کی جو آگ جل رہی ہے، ان کی صحبت سے آتش عشق کے ان شعلوں سے دلوں کو حرارت پہنچائی جائے۔

یہ مختصر مضمون اس تفصیل کا مزید متحمل نہیں، اس موضوع پر ہم نے اپنی متعدد کتابوں میں جامع بحث کی ہے۔

افراد معاشرہ

اور ریاست کی اصلاح کی صورت کیا ہو؟

ایک مکتوب کے جواب میں اہم مباحث

(ماخوذ ''بیداری'' اکتوبر ۲۰۰۵ء)

محترم اشفاق احسان صاحب ایک تفصیلی خط میں لکھتے ہیں۔

''ہمارے مدارس اور درپیش چیلنج'' کے عنوان سے مضمون میں آپ نے جو کچھ لکھا ہے، اس کی سچائی اور ضرورت سے انکار نہیں، لیکن آپ کی تحریر سے کچھ متشرح ہوتا ہے کہ آپ کا اشارہ صوفیائے کرام کے طریق تربیت کی طرف ہے، جو راقم کی رائے میں ہمارے زمینی حالت کے مطابق نہیں، نفوس بیحد کمزور ہو چکے ہیں، تہذیب وتمدن کی خوشنمائی نے سحر زدہ کر کے نہ چھپنے والی آگ بھڑکا رکھی ہے۔ ایسے میں بزرگوں کے طریق تربیت کے بارے میں سوچنا اور اس کی سفارش کرنا نتیجہ کے لحاظ سے بے اثر ثابت ہوسکتا ہے، اس کی بنیادی اور بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کے طریقوں میں چلہ کشی ہے۔ مراقبے ہیں اور تسبیحات ہیں، جو یوں بھی عام انسانی تحمل کیلئے ہمیشہ زیادہ صبر آزما اور روحوں کو تھکانے والے ثابت ہو کر، محض گنتی کے چند ہی مخصوص افراد کیلئے باعث کشش بنتے رہے ہیں، اس کھلی حقیقت سے ظاہر ہے کہ لوگوں کی ۹۹ فی صد تعداد اپنی مادی اغراض کی خاطر تو اولیائے کرام سے رجوع کرتی رہی، لیکن ان سے روحانی اور اخلاقی فیض اٹھانے والے شاید ایک فی صد بھی کبھی نہیں رہے۔

آج دنیا میں اخلاقی، روحانی، سیاسی اور مادی غرض کہ ہر اعتبار سے ہمارے زوال پذیر ہونے کا سبب یہ ہے کہ ہماری مذہبی قیادت خود معاشرہ کو سنبھالنے کی صلاحیتوں سے عاری ہے اور اخلاقی اعتبار سے معاشرہ کو سہارنے کے لئے اپنے کردار کی ادائیگی پر آمادہ نہیں۔ رہے صوفیائے کرام تو چند صوفیاء کو چھوڑ کر انکا تعلیم وتربیت کا طریقہ چونکہ عام انسانی تحمل سے بہت زیادہ صبر آزما اور افراد کو جلد تھکا دینے والا ہے، محض چند مخصوص افراد ہی انکی اخلاقی تعلیم سے فیض یاب ہوسکے اور عوام کی کثیر ترین تعداد انکے تربیتی نظام سے استفادہ نہ کرسکی۔

میں یہ گذارش کرنا چاہتا ہوں کہ بزرگوں کے آزمودہ طریقے اگر سابقہ ادوار میں قومی اور ملی اخلاق کی حسب ضرورت اصلاح نہیں کر سکے تو موجودہ دور میں تو جبکہ نفوس کو مغربی تہذیب وتمدن دیمک کی طرح چاٹ چکے ہیں، پرانے طریقوں کو آزمانا، اصلاحِ اخلاق کیلئے اور بھی زیادہ غیرحکیمانہ اور بے ثمر ثابت ہوسکتا ہے۔

حالات کی تبدیلی اگر غیرمشروع چیزوں کو مباح اور مشروح شروع چیزوں کو مکروہ بنا سکتی ہے تو کیوں نہ ہم اپنے ماحول اور حالات کی ضرورت اور حکمت پر غوروفکر کرتے ہوئے اپنے تربیتی طریقوں کو جدید تقاضوں کے مطابق عوام الناس کیلئے زیادہ سہل، زیادہ موثر اور زیادہ قابل عمل بنانے کی جستجو کریں۔

اس ضمن میں میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ترقی یافتہ اقوام کا طریقہ تعلیم وتربیت ہمارے طریقوں سے زیادہ موثر، زیادہ فطری اور زیادہ سہل ثابت ہوا ہے، ہمارے سابقہ تجربات اور موجودہ حکمت کا تقاضہ یہ ہے کہ ہم ان اقوام سے سائنسی علوم اور ٹیکنالوجی سیکھنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتے، اپنی قوم کی تربیت کے معاملہ میں بھی (ممکن حد تک) ان سے کچھ سیکھنے میں کسی حجاب یا تعصب کو اپنے آڑے نہیں آنے دینا چاہیئے۔ اور ''حکمت مومن کی میراث ہے۔''

والی پُرحکمت حدیث رسول کو اپنے پیش نظر رکھنا چاہیئے۔

اپنی اس رائے کی مزید وضاحت کیلئے میں یہاں چند امثال پیش کرنا

چاہتا ہوں۔

۱۔ مغرب کے ٹھیٹھ مادہ پرستانہ معاشرہ میں تعلیم وتربیت پانے والے عیسائی مشنری آج بھی ہزارہا کی تعداد میں جس مخلصانہ اور فداکارانہ جذبے کے ساتھ خطرناک جنگلوں، بے آب وگیاہ صحراؤں اور دور دراز پہاڑوں کی چوٹیوں پر اپنے فرائض انجام دیتے اور ناقابل برداشت صعوبتوں کو برس ہا برس تک جھیلتے ہیں، اسکی مثالیں ہمیں اپنے داتا درباروں، دہلی، پاک پٹن اور اجمیر شریف کے آستانوں میں آرام فرما اولیائے کرام ہی کے اعمال میں مل سکتی ہیں، سوال یہ ہے کہ ان مشنریوں میں فدا کارانہ جذبہ اور یہ صبر واستقامت کس تربیت کا نتیجہ ہے؟ کیا صوفیانہ طور وطریق پر عمل پیرا ہونے کا؟ اس کا جواب بالیقین نفی میں ہے۔

۲۔ چند سال قبل کچھ بیورو کریٹس، صنعتکار اور صحافی حضرات ایک سرکاری دعوت پر جرمنی گئے اور اپنے دورے کے اختتام پر کسی صحت افزا مقام کے لئے ایک ہوٹل میں قیام کیا، قریب میں مقیم کسی جرمن جوڑے سے ان کی ملاقات ہوئی، جو خود بھی چند روزہ قیام کیلئے انکے پڑوس میں آ کر ٹھیرا تھا، چند روز کی یہ ملاقات سب کیلئے بہت دوستانہ اور خوشگوار ثابت ہوئی کہ ایک دن صبح ہی صبح وہ جوڑا اپنے پاکستانی دوستوں کے کمرہ میں دستک دیتے ہوئے اچانک آموجود ہوا اور ''خدا حافظ'' کہنے کیلئے ان سے رخصت چاہی۔ دوستوں نے بہت اصرار کے ساتھ اپنے ہمراہ اسے لنچ کھانے کی دعوت دی اور درخواست کی کہ وہ محض چند گھنٹوں کیلئے اپنی روانگی کا پروگرام موخر کردے۔ دونوں میاں بیوی نے جو خاصے فاصلے پر کسی کالج میں پروفیسر تھے، یہ عذر کیا کہ انہیں لنچ ٹائم کے فورا بعد اپنی کلاسیں اٹینڈ کرنی ہیں، جو وہ منسوخ نہیں کر سکتے، حد یہ ہے کہ ان دوستوں کے بیحد اصرار کے باوجود وہ ان سے یہ کہہ کر رخصت ہوگئے کہ ہم ایک غیر ضروری دعوت کی خاطر اپنے لیکچر کا وقت برباد نہیں کر سکتے'' یہ احساس ذمہ داری جس تعلیم وتربیت کا نتیجہ تھی، وہ بہرحال ہماری قابل عزت خانقاہوں جیسا صبر آزما اور اور عام لوگوں کی روحوں کو تھکا دینے والا تو ہرگز نہیں ہوتا۔

۳۔ میری اپنی ایک نواسی کافی عرصہ تک لندن میں مقیم رہی، اس نے سرکاری ہسپتالوں میں دو بچوں کو جنم دیا (بغیر کوئی فیس یا دواؤں کی قیمت ادا کئے ہوئے) وہ ڈاکٹروں اور نرسوں کی توجہ، محبت اور جذبہ خدمت کی تعریفیں کرتے کرتے نہیں تھکتی۔ ہر دو مواقع پر ایک خاتون نرس بلاناغہ ہر ہفتہ زچہ اور بچے کی خبر گیری، ان کی صفائی ستھرائی اور دوا دارو کی ضروریات پوری کرنے کیلئے پورے چھ ماہ تک آتی رہی۔ نہایت محبت اور توجہ سے اپنے فرائض انجام دیتی رہی، جن کی تکمیل میں بعض اوقات اسے دو دو گھنٹے بھی لگ جاتے، کیونکہ کسی خاص دوا کیلئے اسے دوبارہ ہسپتال جاکر واپس بھی آنا پڑتا تھا۔ انسانی خدمت اور محبت کا یہ جذبہ بھی تو اسکی کسی تعلیم وتربیت ہی کا نتیجہ تھا، جو بہرصورت ہم سے بہت کچھ مختلف ہوگی۔

آمدم برسرمطلب، آخر میں یہی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اگر آپ اپنے مضمون میں مساجد کے خطبا اور مدارس کے منتظمین حضرات کی تربیت کیلئے خدا خوفی اور تقویٰ وتزکیہ پیدا کرنا چاہتے ہیں اور اسکے لئے صرف پرانے اور لگے بندھے صوفیانہ طریقے ہی آپ کی رائے میں حرف آخر ہیں تو برائے کرم مناسب الفاظ میں بنیادی اخلاقی اوصاف کی ضرورت واہمیت بالوضاحت ان پر ضرور واضح کردیں۔

راقم کی رائے میں اگر ہمارے خطیب اور مدارس کے منتظمین اپنے خطبات اور تعلیم وتربیت کے نصاب میں مشکل حالات اور فتنہ انگیز اکساہٹوں کے مواقع پر صبر واستقامت، سچائی، ایمانداری، عفوو درگذر، انسانی خدمت ومحبت، امانت ودیانت جیسی اعلیٰ انسانی صفات کی تکرار اور نصاب میں شمولیت کو اپنے وظائف کا حصہ بنالیں تو شاگردوں کی کثیر تعداد رفتہ رفتہ اس سے متاثر ہوتی جائیگی اور آہستہ آہستہ انشاء اللہ قوم کا اخلاقی معیار بھی بہتر سے بہتر ہوتا جائے گا، یہی فطری طریقہ ہے اور یہی سہل تر بھی، نیز یہی مغرب کا

طریقہ تعلیم وتربیت بھی ہے۔

دنیا کی پوری تاریخ میں ہر قوم اور ہر مذہب کے رسولوں اور راہنماؤں اور مصلحین نے یہی طریقہ اختیار کیا ہے اور اسی طریقہ کے استعمال سے انہیں کم یا زیادہ کامیابی نصیب ہوئی ہے۔''

محترم اشفاق احسان صاحب نے تصوف کی مشکل اور نا قابل برداشت مشقتوں اور ریاضتوں کی وجہ سے موجودہ حالات میں اس کی عدم افادیت اور یورپ میں نظام تعلیم کے ذریعہ اخلاقی نصب العین کے مطابق ذہنی، فکری اور عملی تبدیلی کا ذکر فرما کر، اس طرح کی تبدیلی کا عمل ہمارے ہاں بھی شروع ہونے کے جذبہ کا اظہار فرمایا ہے۔

اس مختصر نوٹ میں اس موضوع پر تفصیلی اظہار خیال تو مشکل ہے، البتہ کچھ نکات پیش کرنا ضروری ہیں۔

ہر قوم کے مزاج اور نفسیات کی ایک تاریخ ہوتی ہے، کسی بھی قوم کو اس کی تاریخی مزاجی خصوصیات سے مستثنیٰ کر کے، اس کا مطالعہ مشکل ہوتا ہے۔ یورپی قوموں نے اپنی نشاۃ ثانیہ کی تحریک کے دوران متوسط طبقات اور نئے ابھرتے ہوئے مالداروں کی مدد سے کلیسا اور بادشاہ کے خلاف جو جنگیں لڑیں اور سائنسدانوں اور دانشوروں نے علمی اور عقلی آزادی اور فرد کے سیاسی ومعاشی حقوق کے لئے جس طرح اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا اور اہل علم واہل دانش نے سیکولرزم پر مشتمل جو نئے نظریات پیش کئے اور ان نظریات کے فروغ کے لئے قوم میں جو جوش وخروش پیدا ہوا اور پوری قوم بادشاہ اور کلیسا کی گرفت سے آزاد ہو کر سیکولرزم کی بنیاد پر اپنے سیاسی اور اجتماعی نظام کی تشکیل کے لئے ڈٹ گئی، اس میں مبالغہ لاکھوں سائنسدانوں، دانشوروں اور فلاسفروں کو موت اور قید وبند کا سامنا کرنا پڑا، کلیسا اور مطلق آمریت کے خلاف یورپی قوموں کی جدوجہد نے ہی وہ صورتحال پیدا کی، جسے فرد کے حقوق، فرد کی آزادی، عورت ومرد کے مساویانہ حقوق، حکومت کی تشکیل میں ہر فرد کی رائے کے حق، بنیادی انسانی حقوق کے تحفظ، ریاست کی طرف سے بے روزگاری کے الاؤنس، عدل وانصاف کی فراہمی اور نظام تعلیم کے ذریعہ افراد معاشرہ میں قوم سے وفاداری ومحبت کے جذبہ کی نشوونما، اور قومی اخلاق وکردار کے نام سے کچھ اوصاف وخصوصیات پر مشتمل مزاج کی تشکیل وغیرہ۔ یورپ کے اجتماعی ریاستی نظام کی یہ خوبیاں وخصوصیات دراصل وہاں شروع کردہ ایک ہمہ جہتی علمی، فکری ونظریاتی تحریک ہی کا ثمرہ ہے، جو یورپ کی نشاۃ ثانیہ کے دور میں چلائی گئی۔ اس کا پھل یورپ پچھلے دو تین سو سال سے کھا رہا ہے۔

چونکہ اہل یورپ کی مذہب کی صحیح تعلیمات مسخ ہو چکی تھی، وہ علم، عقل اور سائنسی کھوجنا کی دشمنی پر مبنی صورت اختیار کر گیا تھا۔ اہل مذہب ہر نئی سائنسی تحقیق کو کفر ومذہب کی جنگ شمار کرتا تھا، اس لئے اہل یورپ کو مجبوراً مذہب کو ریاست کے اجتماعی نظام سے بے دخل کرنا پڑا۔

محترم اشفاق احسان صاحب نے یورپ کی جن قومی خصوصیات کی تعریف فرمائی ہے۔ یہ قومی خصوصیات ان کے اندر یوں ہی پیدا نہیں ہوئی۔ اس کے لئے اہل یورپ کو دو سو سال تک کلیسا اور مطلق حکمرانوں سے خوفناک جنگیں لڑنی پڑیں، اس طویل جنگ میں متوسط طبقات کی کامیابی کا بنیادی سبب نئے ابھرتے ہوئے صنعتی طبقہ کا بھرپور مالی تعاون تھا۔ چونکہ بادشاہ، کلیسا اور جاگیردار طبقات اپنے مشترکہ مفادات کی خاطر صنعت کے مخالف تھے۔ جب کہ صنعتکاروں کی ترقی، سائنسی ترقی اور آزادانہ غور وفکر اور تلاش وتحقیق سے وابستہ تھی، اس لئے نئے ابھرتے ہوئے صنعتی طبقہ نے اس جنگ آزادی میں فیصلہ کن کردار ادا کیا۔ اس لئے یورپ کی موجودہ قومی خصوصیات، فرد کی آزادی وحقوق اور انہیں میسر سہولتوں اور معاشرہ میں انہیں حاصل مراعات اور ریاستی اداروں کا عام افراد کے خادم کی حیثیت سے کردار ادا کرنا، یہ سارا کچھ ایک بہت ہمہ گیر تحریک اور غیر معمولی انقلاب ہی کا نتیجہ وثمر ہے۔ اس کے لئے سب سے پہلے ہزارہا دانشوروں نے نئی فکر دینی شروع کی، اس فکر کے نتیجہ میں ذہن بننا شروع ہوا۔ اس ذہن کے نتیجہ میں تحریکیں شروع ہوئیں، جو کامیابی سے ہمکنار ہوئیں۔

ہماری تاریخ یورپ کی تاریخ اور اس کے مزاج سے بالکل مختلف ہے۔ اس لئے اہل یورپ جیسے انقلاب کی امید رکھنا ہمارے ہاں عبث ہے۔

محترم جناب اشفاق احسان صاحب نے عیسائی مشنریوں کے فداکارانہ جذبہ کے ساتھ جنگلوں، پہاڑوں اور اور بے آب وگیاہ صحراؤں میں کام کرنے کا بھی ذکر فرمایا ہے اور ان کے فداکارانہ جذبہ سے سیکھنے کی ضرورت پر زور دیا ہے۔ عیسائی مشنریاں یقیناً بڑے

جذبہ کے ساتھ کام کررہی ہیں اور اس میں کافی مقدار میں ڈاکٹر، انجنیئر اور ٹیکنیکل افراد بھی مصروف کار رہتے ہیں۔ ان کے جذبہ کی قدر نہ کرنا ناانصافی ہوگی، لیکن اس کا ایک سبب تو یہی ہے کہ اہل مغرب میں مہم جوئی کی جو صلاحیت دوتین سوسال سے پیدا ہوئی ہے، اس میں اس کے اثرات شامل ہیں۔ اہل مغرب جس شعبہ میں بھی کام کرتے ہیں، وہ اس شعبہ میں فنا ہوجاتے ہیں۔ فنائیت کے مزاج کی وجہ سے ظاہر ہے کامیابی ہوتی ہے۔ اس کا دوسرا بڑا سبب یہ ہے کہ عیسائی مشنریوں کو یورپی ریاستوں کی طرف سے عالمی سطح پر تبلیغ عیسائیت کے لئے سالانہ کروڑیں ڈالر ملتے ہیں، جس کی تفصیلات رسائل واخبارات میں آتی رہتی ہے۔ وسائل کی کشش بھی باصلاحیت افراد کے لئے وقت دینے کا ذریعہ بنتی ہے۔ تیسرا سبب عیسائی مشنریوں کی گہری منصوبہ بندی ہے۔ وہ مبلغوں کی تربیت اور ان میں مشنری اسپرٹ پیدا کرنے کا خصوصی اہتمام کرتے ہیں، عیسائی مشنریوں کے جذبہ کی تائید کرنے کے ساتھ ساتھ اس حقیقت کا اظہار بھی ضروری ہے کہ اسلام کے دعوتی کام کے لئے ہمارے ہاں عالمی سطح پر تبلیغی جماعت کی طرف سے جو کام ہورہا ہے، وہ ایسا کام ہے، جو عیسائی مشنریوں کے کام سے کہیں بڑھ کر قابل قدر ہے۔ ہرسال کئی سو جماعتیں ہندستان وپاکستان سے نکلتی ہیں، جو دنیا بھر میں دعوتی فریضہ سرانجام دیتی ہیں، جن میں عام لوگوں کے ساتھ ساتھ جدید پڑھے لکھے افراد بھی شامل ہوتے ہیں۔ یہ لوگ ایک ایک سال اس کام کے لئے دیتے ہیں، بڑی بات یہ کہ کسی حکومت اور کسی ادارہ کے مالی تعاون کے بغیر اپنے ہی اخراجات کے ذریعہ یہ دعوتی فریضہ سرانجام دیتے ہیں۔

تصوف واہل تصوف کے بارے میں محترم جناب اشفاق احسان صاحب نے جو کچھ فرمایا ہے، اس میں سنی سنائی باتوں یا دور سے مشاہدہ کی آمیزش زیادہ محسوس ہوتی ہے۔ برصغیر ہند میں ہندو اکثریت کے علاقہ میں مسلمان ایک ہزار سال تک اگر صحیح سلامت رہے اور اپنے امتیازی وجود کو ایک حد تک قائم وبرقرار رکھتے رہے تو اس میں اگر سب سے زیادہ کسی طبقہ کا کردار ہوسکتا ہے تو وہ اہل تصوف اور بزرگان دین ہی کا طبقہ تھا۔ اس طبقہ نے زہد، دنیا سے بے نیازی، کردار کی بلندی، انسانیت نوازی اور رواداری جیسے جوہروں سے مزین ہوکر اور اللہ کی محبت سے سرشار ہوکر لوگوں کی تربیت اور تہذیب کا اس طرح کارنامہ سرانجام دیا کہ حکمرانوں کی سطح پر جو کچھ بھی ہوتا رہا، وہ تو ہوتا ہی رہا۔

لیکن عوامی سطح پر مسلم معاشرہ اخلاقی نصب کی قوت سے بہرہ ور رہا۔ اُس زمانہ میں عام مسلمان ناقابل فروخت تھا، اسے بڑی سی بڑی دولت سے بھی خریدنا مشکل تھا۔ وہ کردار میں مستحکم تھا۔ اسلام سے اس کی وابستگی ووفاداری مسلم تھی۔ ایک ہزار سال تک ہندوتہذیب کی طرف سے یہاں مسلمانوں کو سینکڑوں چیلنج درپیش ہوئے۔ اسلامی تہذیب کو ہندوتہذیب میں ضم کرنے کے لئے لاتعداد کوششیں ہوئیں، لیکن صوفیائے کرام اور علمائے ربانی نے خانقاہی تربیتی نظام کے ذریعہ لوگوں کی اخلاقی ودینی حالت کو اس طرح مستحکم رکھا تھا کہ حکمرانوں کی باہمی لڑائیوں، فروغ اسلام کے کام سے ان کی سردمہری اور عیاشیانہ زندگی میں فنائیت کے باوجود برصغیر ہند کا مسلم معاشرہ اخلاقی بلندی کے اعتبار سے مضبوط رہا۔ جب حکمران طبقات کی بدکرداری اور جنگِ اقتدار اور ناعاقبت اندیشی بڑھتی گئی اور یورپی استعمار کا عمل دخل بڑھتا گیا تو اس کے نتیجہ میں ہمارا زوال بھی ہمہ گیر ہوتا گیا۔ تصوف واہل تصوف کے بارے میں یہ سمجھنا کہ ان کا کردار شروع سے محدود رہا، یہ صحیح نہیں، حضرت مجدد الف ثانی کے فرزند ارجمند حضرت خواجہ محمد معصومؒ کے بارے میں کتابوں میں تصریح موجود ہے کہ ہندستان بھر میں ان کے براہ راست اور بالواسطہ آٹھ ہزار خلفاء تھے۔ ہندستان کا کوئی صوبہ اور علاقہ ان کے خلفاء سے خالی نہیں تھا۔ ان کے ان خلفاء سے اصلاح کے سلسلہ میں لاکھوں افراد وابستہ تھے۔ اورنگ زیب عالمگیر کی تربیت کے لئے بھی انہوں نے ان کی درخواست پر اپنے ایک فرزند کو متعین کیا تھا، جنہوں نے اورنگ زیب کو باقاعدہ سلوک طے کرایا۔

تصوف کی خانقاہیں صدیوں تک لوگوں کے رجوع کا مرکز رہیں، ایک ایک خانقاہ میں بیک وقت ہزارہا افراد مقیم رہتے تھے اور ان کے کھانے پینے کا سارا انتظام اہل خانقاہ کی طرف سے مفت ہوتا تھا۔ یہ خانقاہیں کوئی دوچار نہیں، ملک بھر میں سیکڑوں کی تعداد میں ہوتی تھیں۔ آج سے سوسال پہلے تک یہ حال تھا کہ ہمارے معاشرہ کا ہر فرد کسی نہ کسی بزرگ سے نسبت کا تعلق رکھتا تھا۔

اصل میں تصوف میں دوطرح کی ریاضتیں ہیں۔ ایک تو خصوصی افراد کی ریاضتیں ہیں، جن کی تربیت کرکے ان سے معاشرہ میں دعوت کا غیرمعمولی کام لینا ہے۔ ان خصوصی افراد کے تصوف میں تو ریاضتیں اور مجاہدے شامل ہیں، لیکن دوسرا تصوف عام لوگوں کی

عمومی اصلاح سے تعلق رکھتا ہے۔ عام لوگوں کے اس تصوف میں زیادہ ریاضتیں اور مجاہدے شامل نہیں، روزانہ ایک آدھ گھنٹے کا ذکر وفکر اور ایک دو ماہ میں صحبت کے لئے وقت نکالنا۔

تصوف کے نظام میں خصوصی لوگوں اور عام لوگوں کی تربیت کے لئے یہ جداگانہ طریق نصاب شروع سے رہا ہے۔ جن لوگوں کو معاش کے لئے جدوجہد کرنی ہے اور گھریلو فرائض سرانجام دینے ہیں، ظاہر ہے، انہیں مجاہدوں میں نہیں چلایا جا سکتا۔ **لاَ یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْساً إِلاَّ وُسْعَھَا**. اہل تصوف نے ہمیشہ اس کا اہتمام کیا ہے۔ اب بھی اس کا اہتمام موجود ہے۔

تصوف کا سارا زور اللہ کے ذکر کے نور کو اخذ کرنے اور دل کو اللہ کی غفلت سے دور کرکے، اس کی محبت سے سرشار کرنا ہے اور نفس کو رذائل سے پاک کرنا ہے۔ یہ عمل ایک دو دن کا نہیں، یہ خاموش عمل ہے۔ جب روزانہ ایک آدھ گھنٹہ کا ذکر ہوتا ہے تو قلب میں انوار کا نزول ہونا شروع ہوجاتا ہے۔ انوار کے اس نزول سے فرد یوں محسوس کرنا شروع کرتا ہے، گویا اس کا پہلی بار جنم ہوا ہے۔ اب تک تو وہ قیل قال اور رسمی اسلام پر عمل پیرا تھا۔ اب پہلی بار حقیقت اسلام اور ورح اسلام سے آشنا ہوا ہے۔ تصوف کا یہ تجربہ ایسا ہے، جسے بیان کرنے کے لئے بڑے سے بڑے الفاظ کا ذخیرہ بھی ناکافی ہے۔ یہ تو ایمان کی وہ حقیقی لذت ہے، جسے حدیث میں ''احسان'' کے نام سے ادا کیا گیا ہے۔ ایمان کی اس لذت سے آشنا ہونا ہر مومن کے لئے ناگزیر ہے۔ اس کے بغیر نفس کی شرارتوں کا ادراک ہونا ہی دشوار ہوتا ہے، اس لئے کہ اس کے بغیر فرد جو زندگی بسر کرتا ہے، وہ عام طور پر عقلی اور علمی سطح کی زندگی ہوتی ہے۔ عقلی اور علمی زندگی خشک زندگی ہوتی ہے، جو ایمان کے لطیف ترین احساسات سے پوری طرح آشنا نہیں ہوتی۔ تصوف واحسان یعنی اللہ سے محبت کا تعلق چونکہ انسانی فطرت کا ناگزیر تقاضا ہے۔ ہر انسان کی فطرت یکساں نوعیت کی ہے، اس لئے فطرت میں موجود محبت کے جذبات کی تسکین کے لئے اگر فرد کو محبوب کے ذکر کی مطلوبہ خوراک حاصل نہ ہوگی تو نہ تو قلبی اطمینان حاصل ہوگا اور نہ ہی حسنِ کردار پیدا ہوگا۔ یورپ کی قوموں کے کردار کو حسن کردار سے تعبیر کرنا صحیح نہ ہوگا، اس لئے کہ یہ تو نظام تعلیم کے جبر سے قومی نوعیت کا کردار ہے، جس میں عقل سے کچھ باتیں منوا کر اور کچھ عادتوں کی تربیت کرکے، کچھ بنیادی معاملات میں انہیں اصولوں کا پابند بنایا گیا ہے۔ اس طرح کے تعلیم کے ذریعہ پیدا ہونے والے قومی کردار سے نہ تو فطرت کے سارے جذبات کی تسکین ہوتی ہے اور نہ ہی خاندانی ومعاشرتی نظام میں استحکام پیدا ہوسکتا ہے۔

محترم جناب اشفاق احسان صاحب نے مغربی طرز کے نظام تعلیم سے جو امیدیں وابستہ کی ہیں اور اس سلسلہ میں جو حسن ظن ظاہر فرمایا ہے، چونکہ ہمارے ہاں بہت سارے حساس افراد اس انداز سے سوچتے ہیں، اس لئے یہاں مختصرا اس کا تجزیہ ضروری ہے۔

مغربی نظام تعلیم وتربیت کی ایک خصوصیت تو یہی ہے کہ اس کے ذریعہ اس طرح کے انسان کی تیاری کا عمل جاری ہے، جو بہتر مادی زندگی بسر کرنے اور قوم وریاست کے حوالے سے اپنی ذمہ داریوں کی ادائیگی کے سلیقہ سے آشنا ہو سکے اور قومی خصوصیات اور قومی اخلاقیات کا حامل بن سکے۔

یقیناً سیاست، معیشت اور اجتماعی زندگی پر اس نظام تعلیم وتربیت کے بہتر اور مؤثر اثرات ظاہر ہوئے ہیں اور آج مغربی انسان مادی سہولتوں، سیاسی آزادی اور تمدنی ترقی کے اعتبار سے معلوم انسانی تاریخ میں سب سے زیادہ خوش نصیب انسان شمار ہوگیا ہے۔ اس نظام تعلیم کا دوسرا سب سے اہم منفی پہلو بھی ہے، جس نے مغربی انسان کو انسانیت کے لئے المیہ بنا دیا ہے اور بروبحر کو فساد سے بھر دیا ہے اور آخرت کے جہنم سے پہلے اس دنیا کو ذہنی، نفسیاتی اور وجدانی طور پر جہنم کا نمونہ بنادیا ہے۔ مغربی نظام تعلیم کا وہ پہلو یہ ہے کہ انسان، کائنات اور اجتماعی زندگی کے حوالے سے سارے سائنسی، طبعیاتی، نفسی ونفسیاتی علوم کو خدا کے تصور وعقیدہ سے خارج کردیا گیا ہے۔ اور ان علوم کی بنیاد میں اس تصور کو راسخ کر دیا گیا ہے کہ جو چیز عقل اور حواسہ خمسہ کے مشاہدہ میں نہ آئے، وہ سرے سے موجود ہی نہیں ہے اور اس کا انکار کیا جائے۔ علوم کو تصورِ خدا سے نکال کر تصور مادیت سے سرشار کرنے کا جو نتیجہ ظاہر ہوا ہے، وہ یہ ہے کہ انسان جو فطرتا خدا سے محبت کا داعیہ رکھتا ہے اور اس کی شخصیت کی ساری تان بان اس محبت سے ہی متشکل ہوئی ہے اور اس شخصیت کے سارے وجود اور اس وجود کی ساری کڑیوں کی سلامتی ہی اس بات سے وابستہ ہے کہ وہ دل وجان سے خدا کی محبت کے ذریعہ اپنے جذبات کی تسکین کرے، وہ اللہ کی محبتِ اور اللہ کے تصور سے عاری ہوکر، ترقی یافتہ حیوان کی صورت اختیار کر گیا ہے اور

ایک طرف تو وہ نفسی، نفسیاتی، اعصابی، وجدانی اور روحانی طور پر ہزارہا امراض کا شکار ہوکر، خود اعتمادی کے بحران میں مبتلا ہوگیا ہے۔دوسری طرف اللہ کی محبت سے پھوٹ کر نکلنے والی صفات واوصاف محبت، شفقت، رحم، حقیقی انسانیت نوازی، اخلاق حسنہ، ایک دوسرے سے اللہ کی خاطر تعلق خاطر رکھنا، دنیا سے بے نیازی، مادی سودو زیاں سے بلند ہونے کا نقطہ نگاہ، ماں باپ اور رشتیداروں سے صلہ رحمی کرنا، شرم وحیا اوعزت وعصمت کے پاکیزہ تصورات کی پاسداری، دوست واحباب سے بے غرضانہ ومخلصانہ تعلقات، بے لاگ جنسی جذبات پر رضا کارانہ طور پر قدغن لگانا، قوم پرستی کے تصورات سے بلند ہوکر، انسانوں کو انسانی نقطہ نگاہ سے دیکھنا اور معاملہ کرنا، غرض کہ مغربی انسان ان سارے اوصاف سے محروم ہوگیا ہے۔

تیسری طرف سائنسی اور ٹیکنالوجی ترقی کی وجہ سے وہ قدرت کی ایسی قوتوں کو مسخر کرنے کا ذریعہ بن گیا ہے، جن قوتوں سے انسان کی حیثیت سے کام لینے کی صلاحیتوں سے وہ عاری ہے۔ چنانچہ بڑھتی ہوئی سائنسی ترقی اور ٹیکنالوجی انسانی ہلاکت کا موجب بن گئی ہے اور چند ہزار سرمایہ دار ملٹی نیشلز کی صورت میں پوری انسانیت کے دل ودماغ کو کنٹرول کرنے، انہیں مادہ پرستانہ کلچر کے سانچہ میں ڈھالنے، ان پر اپنے مادہ پرستانہ نظریات ٹھونسنے اور گلوبلائیزیشن کے ذریعہ سیاست، معیشت، معاشرت، تعلیم اور پبلسٹی کے ذریعہ ایسے حالات پیدا کر چکے ہیں، جس سے پوری دنیا کی دولت کھنچ کر ملٹی نیشلز کے ہاں پہنچ جائے۔ انسانوں کی عظیم اکثریت فاقوں کی وجہ سے بلبلا اٹھے، علاج ومعالج کی رقوم نہ ہونے کی وجہ سے امراض کا شکار ہوجائے، گلوبلائیزیشن کے علمبردار عالمی سرمائیداروں کو اس سے کوئی واسطہ نہیں، وہ حیوانوں کا دل رکھتے ہیں، انہیں تو سرمایہ اور فقط سرمایہ چاہئے، اس مقصد کے لئے ساری انسانی قدریں تباہ ہوجائیں اور انسانی کلچر بدترین حیوانی صورت اختیار کر جائے تو کوئی ہرج نہیں، عالمی سرمائیدار کو صرف اور صرف سرمایہ چاہئے اور انسانی محنت کے خون پسینہ کا حاصل چاہئے۔ عالمی سرمائیدار کے سامنے دنیا پر اپنی خداوندی کو مسلط کرنے اور انسانوں کو آخری حد تک اپنا زیردست بنانے کے علاوہ اور کوئی مقصد پیش نظر نہیں ہے۔

سرمایہ دار اور سرمایہ دارانہ ذہنیت مغربی نظام تعلیم ہی کی پیداوار ہے۔ اس نظام تعلیم کا یہ وہ منفی اور تاریک پہلو ہے، جس کے مقابلہ میں اس کی افادیت کا پہلو غیراہم سا ہوجاتا ہے۔

جب نئے نئے نظریات گھڑ کر سارے علوم وفنون اور اجتماعی زندگی سے اللہ کے تصور کو خارج کر دیا جائے گا اور سیاست، تجارت، صنعت، سائنس، انتظامیہ وغیرہ کی تشکیل سیکولرزم کی بنیاد پر ہوگی، وحی کی تعلیمات سے سرے سے انکار ہوگا تو ہزارہا سالوں کے انسانی تجربات سے استفادہ کرکے، اپنی قوم کی دنیا کی زندگی بہتر بنانے کے لئے تو ریاستی نظام ایک حد تک بہتر بنایا جا سکے گا، جس میں افراد کو مادی اعتبار سے جملہ سہولتیں حاصل ہوں گی۔ عدل وانصاف کی فراہمی بھی ہوگی۔ لیکن قوم کو عالمگیر انسانی اخلاقیات کا حامل بنانا، ان کے ذہنوں پر انسانیت کے نقطہ نگاہ کو غالب کرنا، انہیں نفسی، نفسیاتی، دماغی اور اعصابی بیماریوں سے بڑی حد تک نجات دلانا، خوشحال زندگی اور مادی تعیّشات سے آخری حد تک لطف اندوز ہوکر ڈپریشن، مایوسی، احساسِ تنہائی اور خودکشی کے خیالات سے بچانا، فاضل دولت سے پسماندہ قوموں کی بھلائی کا پروگرام بنانا، حیوانی مقاصد سے کچھ دیر کے لئے بلند ہوکر، پاکیزہ انسانی مقاصد کو پیش نظر رکھنا، یہ ساری چیزیں ایسی ہیں، جس کی بے خدا نظام تعلیم وتربیت سے امید رکھنا عبث ہے۔

اس ضمنی بحث کے بعد اب ہم پھر تصوف واحسان کی طرف آتے ہیں۔

آج جب کہ انسانیت مادہ پرستی کے عالمگیر ہولناک اثرات کہ وجہ سے بُری طرح ذہنی ونفسیاتی اور اعصابی امراض کا شکار ہوگئی ہے۔ مغرب کے ہر ملک کے ہر شہر کے ہر محلّہ میں نفسیاتی ڈاکٹروں کی فوج ظفر فوج تیار ہوگئی ہے۔ مغرب کا تقریبا ہر دوسرا فرد نفسیاتی مریض بن چکا ہے۔ مغرب کی بڑھتی ہوئی مادہ پرستی پر مشتمل تہذیب کے یہی اثرات مسلم ممالک میں تیزی سے پرواں چڑھ رہے ہیں۔ اس طرح کی صورتحال میں تصوف واحسان سے وابستہ مسلم نفسیات کے ۱۳ سوسالہ ادارہ کی اہمیت کو نظر انداز کرنا اور اسے مختلف طریقوں سے غیراہم ثابت کرنا اور اس نفسیات سے استفادہ کرکے، اپنے افرادِ معاشرہ کے زندگی کے حوصلہ وہمت کو قائم وبرقرار رکھنے میں معاون ثابت نہ ہونا اور تصوف واحسان کے ادارہ کے ذریعہ **وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَمَا كُنْتُمْ** اور **اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا** کے تصور کو راسخ کرنے میں معاون نہ ہونا، یہ دورسی اور دوربینی ہرگز نہ ہوگی۔

ہمارے ہاں مسلم نفسیات سے دوری کی جو صورتحال پیدا ہوگئی ہے، وہ کئی اعتبار سے تشویشناک ہے۔ اس اعتبار سے بھی کہ ہم قرآن وسنت اور طویل تجربات ومشاہدات سے ماخوذ بزرگوں اور علمائے ربانی کے علوم سے کورے ہونے کی وجہ سے تہی دامن ہوتے جارہے ہیں۔ اور اس اعتبار سے بھی کہ اب ہمارا معاشرہ مغرب کی طرح تیزی سے نفسیاتی، اعصابی اور ذہنی مریضوں کے معاشرہ میں تبدیل ہوتا جارہا ہے اور تحمل اور برداشت ختم ہوکر، معمولی مسائل پر اپنی ذات سے بیزاری کے رجحان کی وجہ سے خودکشی کا عمل جاری ہے۔ مسلم نفسیات کیا ہے؟ اپنی ذات سے آشنائی کا نام ہے۔ اور اپنی اندر کی پوشیدہ قوتوں کے مشاہداتی علم کے ذریعہ منفی قوتوں پر کنٹرول اور مثبت قوتوں کی فروغ پذیری ہی مسلم نفسیات کا موضوع ہے۔ مسلم نفسیات بڑے پن سے دستبرداری اور چھوٹے پن کے انسانیت کا سفر طے کرنے کا نام ہے۔ مسلم نفسیات، عقل کو نفس کی یرغمالی سے بچا کر اسے قلب سلیم کے حوالے کرنے کا نام ہے، تاکہ قلب سلیم انوار الٰہی کی منتقلی کے ذریعہ عقل کو عقل سلیم بنا سکے۔

مسلم نفسیات، مطلق ہستی ذات سے رابطہ مستحکم کرکے، اعصاب ونفسیات کے نظام کو معتدل بنانے اور اس نظام میں پیدا ہونے والے خلل کو ختم کرنے، دل کی رفتار کو متوازن بنانے اور عقل میں موجود سوچ کی لہروں میں نورانیت کے اثرات کو شامل کرکے، پوری انسانی شخصیت کو مطلق ہستی ذات کے اثراتِ نور سے سرشار کرکے، اسے اشرف المخلوقات کی حیثیت دینے کا نام ہے۔ یہ سارا کام قرآن سنت میں پوشیدہ نور سے اخذ فیض کے ذریعہ ہی ہوتا ہے۔

جس مسلم نفسیات نے صدیوں سے دینی واخلاقی اعتبار سے معاشرہ اور افرادِ معاشرہ کی بڑی اکثریت کے اعصاب ونفسیات کو مستحکم کرکے، انہیں صبر، تحمل، قناعت، شکر، تھوڑے پر راضی رہنے، مصائب کو قدرت کی مرضی سمجھ کر، صبر سے جھیلنے اور توکل علی اللہ، غیظ وغضب اور انتقام کے مقابلہ میں معافی جیسے اوصاف پیدا کئے۔ آج مادہ پرستی اور عقلیت کی عالمی تحریک کے زیر اثر اس مسلم نفسیات سے انکار کا نتیجہ اس کے علاوہ اور کیا نکل سکتا ہے کہ جملہ انسانی اوصاف سے محرومی ہو اور معاشرہ، افراد کی نفسی بیماریوں کی وجہ سے ہمہ جہتی فساد سے دوچار ہو۔ کتاب وسنت لوگوں کی اصلاح ازخود نہیں کرتے یا قیل قال کے صاحباں کے وعظ ونصیحت سے اصلاح نہیں ہوتی، اس لئے کہ جو افراد خود اپنی اصلاح نفس سے محروم ہوں، ان کی باتیں اور وعظ ونصیحت تاثیر اور نورانی اثرات سے خالی ہوتی ہیں، بلکہ ان کی باتوں سے معاشرہ میں تضادات ہی جنم لیتے ہیں۔ ہونا تو یہ چاہئے کہ مسلم نفسیات کا نظری علم اور اس نفسیات کے ماہروں کی صحبت کا تربیتی نظام ہمارے نظام تعلیم کا حصہ ہوتا، تاکہ افراد کی شر کی نفسیات پر خیر کی نفسیات کے غلبہ کی صورت پیدا ہو اور مسلم معاشرہ نفسیاتی مریضوں کے معاشرہ میں تبدیل ہونے سے بچ جائے۔ لیکن جدید علوم اور عقلیت کی تحریکوں نے مسلم نفسیات کی حقیقی نوعیت کے فہم کے سلسلہ میں جو غیر معمولی حجابات پیدا کردیئے ہیں، ان حجابات کے دور ہونے کی بظاہر کوئی صورت نظر نہیں آتی۔

مسلم نفسیات کے ماہر یعنی علمائے ربانی کیا چاہتے ہیں؟ وہ تو صرف یہ چاہتے ہیں کہ آپ ہمیں خالی دل دیدیں، تاکہ ہم خالی دل کو پاکیزہ نقش ونگار کے ذریعہ اس کی تہذیب وتطہیر کا فریضہ سرانجام دیں۔ جب اس دل کی تہذیب وتطہیر کا عمل شروع ہوگا تو وہ مادہ پرستی اور عقلِ محض کی کسی تحریک سے متاثر نہ ہوگا۔ ایسا دل صابر وشاکر اور محبوب کی محبت سے سرشار ہوگا۔ اور جملہ انسانی اوصاف سے بھی بہرہ ور ہوگا، لیکن ہماری حالت یہ ہے کہ ہم ہر قسم کے نفسی، نفسیاتی اور ذہنی ودلی امراض کا شکار ہونا بلکہ موت تک قبول کرنا گوارا کریں گے۔ جب کہ دل کو علمائے ربانی کے حوالے کرنے کے لئے تیار نہ ہوں گے۔ ایسے میں بڑے سے بڑا ماہر، نفسیاتی مریضوں کی حالتِ زار پر خون کے آنسو بہائے بغیر اور کیا کرسکتا ہے۔

تصوف، افراد کی باطنی بیماریوں سے بحث کرتا ہے اور ان کا علاج کرتا ہے۔ آج جب کہ ہم میں سے تقریبا ہر فرد باطنی بیماریوں میں مبتلا ہے۔ حب جاہ حب مال، بڑے پن، اعتراض اور بحث ومباحثہ کی نفسیات، اپنے علاوہ سب کو گناہوں کا مجسمہ اور معاشرہ کو بگاڑنے کا ذمہ دار سمجھنے کے زاویہ نگاہ کا مستحکم ہونا، دوستوں، عزیزوں اور اپنی جماعت اور گروہ سے وابستہ افراد سے اکثر شاکی رہنے اور ذہنوں پر ان کے کمزور پہلوؤں کے غالب ہونے کا احساس، سب سے بے اطمینانی، بیزاری اور عدم اعتماد کی صورت کا پیدا ہونا، معمولی اختلاف رائے یا مفادات کے معمولی نقصان یا عزت ووقار میں کمی کے مسئلہ کو تعلقات کی مستقل خرابی اور دشمنی کا ذریعہ بنانا، تضاد اور دوئی کا شکار ہونا، سامنے تعریف

کرنا، پس پشت شخصیت کے گرانے کے لئے کوشاں ہونا، ڈاکٹروں، وکیلوں، افسروں، صحافیوں اور پولیس وغیرہ کی نظروں کا ہر وقت لوگوں کی جیبوں پر رہنا، غرض کہ اس طرح کی سینکڑوں بیماریاں ہیں، جن میں ہم میں سے تقریباً ہر شخص کسی نہ کسی حد تک مبتلا ہے۔ لیکن ان بیماریوں میں مبتلا ہونے کے باوجود المیہ یہ ہے کہ نزع کی حالت میں مبتلا ہر مریض یہ سمجھتا ہے کہ وہ صحتمند ہے، اس کے ساتھ ساتھ نہ صرف یہ کہ وہ معالج کی ضرورت محسوس نہیں کرتا، بلکہ اس کا دل معالج کے خلاف طرح طرح کی غلط فہمیوں، عدم اعتماد بلکہ اسے اپنی سطح سے بھی کم تر سمجھنے کے احساس سے بھرپور ہے۔

جب مریضوں سے اپنی بیماری کا ادراک سلب ہوجائے اور معالجوں سے دل بیزار ہوجائے تو ظاہر ہے باطنی وروحانی بیماریوں پر مشتمل معاشرہ ہر طرح کے مفاسد سے بھر جاتا ہے، اور وہ اس معاملہ میں دنیا کے دوسرے معاشروں کے لئے عبرت کا موجب بن جاتا ہے۔

تصوف واحسان دراصل فرد کی نفسیات کو متوازن بنانے کا سب سے بڑا ادارہ ہے۔ اس کا پہلا اور بنیادی نکتہ ہی یہ ہے کہ فرد اہل اللہ کی بزرگی کو تسلیم کرکے، ان کے تلمذ کی حیثیت سے اس کے سامنے پیش ہو۔ اللہ کو بندہ کی فروتنی کی یہ ادا ایسی پسند ہے کہ بس محض اس کا خودسپردگی کی حیثیت سے پیش ہونا ہی اسے تو اور میں کے حجابات اور بڑے پن اور تفاخر کے جذبات سے ایک حد تک نجات دلانے کے لئے کافی ہوجاتا ہے۔ اگرچہ اصلاح کا عمل آہستہ آہستہ ہی شروع ہوتا ہے۔ لیکن ایک بار خودسپردگی سے ہی فرد کو غیریت اور دوئی سے نجات کا ایک حد تک اندازہ وادراک حاصل ہوجاتا ہے۔

بڑوں کی بزرگی مان کر چھوٹے پن کی حیثیت سے ان کے سامنے پیش ہونا، موجودہ دور میں بالخصوص جتنا مشکل ہوگیا ہے، وہ سامنے کی بات ہے، کسی ذہین اور باصلاحیت فرد کو یہ کہنا کہ روحانی معاملات میں اہل اللہ کی شاگردی اختیار کرنا چاہئے، اسے مشتعل کرنے اور اس کے مزاج میں گرما گرمی پیدا کرنے کے برابر ہے، حقیقت یہ ہے کہ فرد کی آدھی اصلاح تو محض اس بات سے ہوجاتی ہے کہ وہ خود شکستہ ہوکر اللہ کے دوست کے سامنے آداب عبدیت سیکھنے کی غرض سے پیش ہو۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ ایک بار شیطان نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سامنے پیش ہوکر عرض کیا کہ آپ کلیم اللہ ہیں، اب کی بار اللہ سے گفتگو ہو تو میری سفارش بھی کریں، تاکہ میری توبہ قبول ہو۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام بڑے خوش ہوئے کہ شیطان توبہ کی راہ پر گامزن ہوا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ کے سامنے شیطان کی سفارش پیش کی تو اللہ نے فرمایا کہ شیطان سے کہو کہ توبہ کی ایک ہی شرط ہے، وہ یہ کہ آدم علیہ السلام کی قبر پر جا کر سجدہ کرو۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے شیطان کے سامنے یہ شرط رکھی، شیطان نے کہا کہ میں نے جب زندگی میں آدم کو سجدہ نہیں کیا تو اب موت کے بعد اسے سجدہ کیسے کرسکتا ہوں۔

الغرض یہ کہ بڑے پن کا جذبہ نفسیات میں جو مفاسد پیدا کردیتا ہے، اس کے ہزاروں علاج کا علاج ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ جو لوگ اپنی ہستی کو اللہ کے سامنے مٹا چکے ہیں اور نفس کی فنائیت کی وجہ سے وہ دوئی سے نجات حاصل کر چکے ہیں، ان کی عقیدت ومحبت سے شاگردی اختیار کی جائے۔

تصوف واحسان کا ادارہ معاشرہ کے مجموعی بگاڑ کے اثرات سے متاثر ہونے کے باوجود حقیقت یہ ہے کہ آج بھی اس ادارہ میں وہ قوت موجود ہے کہ اگر زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے باصلاحیت افراد، اصلاح نفس کے سلسلہ میں اس ادارہ سے رجوع ہوں تو یہ ادارہ نہ صرف یہ کہ اللہ کی محبت اور بندوں کی محبت پیدا کرکے، فرد وافراد کو معاشرہ کے لئے نہایت مفیدوکارآمد بنا سکتا ہے، بلکہ یہ ادارہ دینی حمیت پیدا کرنے کا موجب ہوکر داخلی وخارجی باطل کے خلاف صف آرائی کے لئے بھی افراد کار فراہم کرسکتا ہے۔ ایسے افراد کار، جو قول وعمل کے بحران وتضاد سے محفوظ ہوں گے اور جو محض اللہ کے لئے کٹیں گے اور اللہ کے لئے جڑیں گے اور جو اپنی نفسیات کے مدوجزر کے حوالے سے افراد معاشرہ کی نفسیات سے بھی آشنا ہوں گے۔

اس دور میں اگر تصوف واحسان کا ادارہ مؤثر کردار ادا کرنے سے قاصر ہے تو اس کا ایک سبب یہ ہے کہ ذہین، تجربہ کار اور باصلاحیت افراد یا تو عقلیت کی تحریکوں کے زیراثر یا غلط فہمیوں کی وجہ سے یا روایتی پیری مریدی کے رنگ ڈھنگ کو دیکھ کر اس ادارہ سے متنفر ہیں۔ حالانکہ اگر ان حجابات کو ہٹا کر، اہل اللہ سے قربت کا تعلق پیدا ہوجائے تو یہ دیکھ کر حیرت زدگی ہوجائے کہ وہ سارے پاکیزہ جذبات جو للھیت، بےنفسی اور خدمت دین کے لئے مطلوب ہیں، وہ تو اللہ کے ان بندوں کے پاکیزہ قلبوں سے ہی منتقل ہوتے ہیں اور

صبغتہ اللہ کی صورت پیدا ہونے کا ذریعہ تو اللہ کے یہی بندے ہیں، ان سے دوری، ان کے بارے میں غلط فہمیاں اور ان سے سوئے ظن تو حقیقت سے دوری اور اپنے آپ سے دوری اور مخلصانہ کیفیات سے دوری کے ممثال ہے۔

اس دور میں جدید عالمی فکری اور نظری تحریکوں کے زیر اثر ایک اہم نکتہ جو اسلامی فکر کے فاضلوں کے ذہنوں سے ایک حد تک اوجھل ہوا ہے، وہ یہ ہے کہ افراد کی اصلاح کتابی علم، نظریاتی اور اصولی نکات کے تکرار، درسی نظام ونصاب اور وعظ نصیحت اور کانفرنسوں وسیمیناروں سے نہیں ہوتی، کتابی علم اور اصولی تعلیمات کے تکرار سے ذہن یقیناً ایک حد تک متاثر ہوتے ہیں اور شعور کی ایک حد تک تربیت ہوتی ہے۔ لیکن نفس کی قوتوں کے زور کو توڑنے کے لئے شعوری اصلاح کافی نہیں ہوتی، اس کے لئے ذکر وفکر کے ذریعہ اللہ سے محبت کے تعلق کو قائم رکھنے اور مستحکم کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ سارا عمل شعور سے زیادہ وجدان اور دل کا عمل ہوتا ہے۔ دل جب صحبت اور ذکر کے انوار سے نفس کی کثافتوں اور اس کے حجابات سے ایک حد تک آزاد ہونے لگتی ہے تو زندگی میں حقیقی انقلاب کا عمل شروع ہوتا ہے اور زندگی کے سارے پہلو اور گوشے بدلنا شروع ہوجاتے ہیں اور اللہ اور اس کے دین کے لئے حساسیت اتنی بڑھ جاتی ہے کہ داخلی وخارجی زندگی میں موجود منکر وباطل کے خلاف وحشت اور طبعی بیزاری کی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے۔ شعوری اسلام کے لئے تو یقیناً علم کی ضرورت ہے، لیکن ایمان ویقین کی پختگی اور تہذیب نفس کے لئے محبت کی باطنی حسوں کی بیداری کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے بغیر سیرت سازی کے کام میں استحکام ہونا ہی دشوار ہے۔ محبت کی حسوں کی بیداری کا یہ عمل ذکر وفکر کے تربیتی ماحول کے ذریعہ ہی شروع ہوتا ہے۔ قرآن وسنت کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان واسلام کی ساری عمارت عبادت اور ذکروفکر کی اینٹوں سے ہی مستحکم ہوتی ہے۔ ذکر وفکر نہ صرف یہ کہ نفس کی جبلی قوتوں کو مطیع کرکے، اللہ سے تعلق کے استحکام کا ذریعہ ہے، بلکہ ذکر وفکر میں ایسا نور پوشیدہ ہے، جو بجائے خود علم میں غیر معمولی اضافہ کا بھی ذریعہ ہے، یعنی ذکر وفکر کے نتیجہ میں وہ باطنی صلاحیت پیدا ہوتی ہے، جس سے صحیح اور غلط کے درمیاں تمیز پیدا ہونے کی قوت بھی حاصل ہوجاتی ہے۔

اس سلسلہ میں ذیل میں قرآن کی چند آیتیں پیش کی جاتی ہیں، جس سے واضح ہوتا ہے کہ اصولی تعلیمات کی تکرار اور چند بنیادی نکات پر زور دینے سے اصلاح وتبدیلی کا عمل شروع نہیں ہوتا، بلکہ فرعونِ نفس کو مضمحل کرنے میں فیصلہ کن کردار اللہ کا ذکر ہی ادا کرتا ہے اور ذکر کا یہ ملکہ ذکر کے خاص ماحول اور اہل اللہ کی صحبت سے ہی حاصل ہوتا ہے۔

أَلَمْ يَأْنِ لِلَّذِينَ آمَنُوا أَن تَخْشَعَ قُلُوبُهُمْ لِذِكْرِ اللَّهِ ۔ (کیا ایمان والوں کے لئے اب بھی اس کا وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کے ذکر سے کانپ جائیں)۔

فَوَيْلٌ لِّلْقَاسِيَةِ قُلُوبُهُم مِّن ذِكْرِ اللَّهِ أُوْلَئِكَ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ. (پس ان لوگوں کے لئے ہلاکت ہے جن کے دل اللہ کے ذکر سے متاثر نہیں ہوتے، یہ لوگ کھلی گمراہی میں ہیں)۔

اسْتَحْوَذَ عَلَيْهِمُ الشَّيْطَانُ فَأَنسَاهُمْ ذِكْرَ اللَّهِ أُوْلَئِكَ حِزْبُ الشَّيْطَانِ أَلا إِنَّ حِزْبَ الشَّيْطَانِ هُمُ الْخَاسِرُونَ. ان پر شیطان کا تسلط ہوگیا ہے پس اس نے ان کو اللہ کے ذکر سے غافل کر دیا ہے یہ لوگ شیطان کا گروہ ہیں، خوب سمجھ لو یہ بات محقق ہے کہ شیطان کا گروہ خسارہ والا ہے۔

أَقِمِ الصَّلاةَ لِذِكْرِي . نماز قائم کرو میرے ذکر کے لئے۔ یعنی نماز جو مقاصد دین میں شامل ہے، اس کے بارے میں فرمایا جارہا ہے کہ اس کا مقصود بھی ذکر کا استحضار ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا گیا ہے **اذْهَبْ أَنتَ وَأَخُوكَ بِآيَاتِي وَلَا تَنِيَا فِي ذِكْرِي** . (اے موسیٰ تم اور تمہارے بھائی فرعون کے طرح جاؤ میری آیتوں کے ساتھ، لیکن دیکھنا میرے ذکر سے غافل نہ ہونا) قتال کے موقعہ کے وقت بھی جس چیز کی یاددہانی فرمائی گئی ہے وہ ذکر ہی ہے۔ **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُواْ إِذَا لَقِيتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُواْ وَاذْكُرُواْ اللّهَ كَثِيراً.** اے ایمان والو، جب تمہاری کفار سے مڈبھیر ہو تو ثابت قدم رہو اور اللہ کا کثرت سے ذکر کرو۔

خود حضورﷺ کو دعوۃ کے عظیم کام سے فارغ ہونے کے بعد اللہ کی طرف رجوع ہونے کا فرمایا گیا ہے۔ **فَإِذَا فَرَغْتَ فَانصَبْ وَإِلَى رَبِّكَ فَارْغَبْ** (آپ جب فارغ ہوجائیں تو ریاضت کریں اور اپنے پروردگار کی طرف توجہ رکھیں)۔

جن کا دل اللہ کی یاد سے غافل ہے، ان کے بارے میں تاکید کی گئی ہے کہ ان کی بات نہ سنو، **وَلَا تُطِعْ مَنْ أَغْفَلْنَا قَلْبَهُ عَن ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوَاهُ.** ان کی بات نہ مانو جس کے دل

کو ہم نے ذکر سے غافل کیا ہے اور وہ خواہشات نفس کا پیروکار ہے۔

وَلاَ تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُونَ رَبَّهُم بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُونَ وَجْهَهُ. (اور ان لوگوں کو اپنی مجلس سے علیحدہ نہ کیجئے جو صبح شام اپنے پروردگار کو پکارتے رہتے ہیں جس میں خاص اس کی رضا کا ارادہ کرتے ہیں)۔

وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُونَ رَبَّهُم بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ. (اپنے آپ کو ان لوگوں کے ساتھ بیٹھنے کا پابند رکھا کیجئے جو صبح شام اپنے رب کو پکارتے ہیں)۔

الغرض یہ کہ معاشرہ میں ہمہ گیر معاشرتی انقلاب (جو سیاسی انقلاب کا بھی ازخود ذریعہ بن جائے گا) کے لئے ضروری ہے کہ مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے دردمند اور باصلاحیت افراد روحانی توانائی اور اخلاقی قوت کے حصول کے لئے تصوف کے ادارہ سے اخذ فیض کریں۔ نفس کی سرکشی اور اس کے زورِ قوت کو ایک حد تک توڑنے کی سعی کریں، اپنے حب جاہ، حب مال اور جذبہ شہرت کے رذائل کی اصلاح کریں۔ غیظ وغضب کے جذبات کو حداعتدال میں لائیں۔ اللہ کے لئے مرنے اور اللہ ہی کے لئے جینے کا سلیقہ سیکھیں۔ باصلاحیت افراد کی طرف سے تربیت کے اس عملی تجربہ سے ایک حد تک گذرنے کے بعد اس سے معاشرہ میں جو معاشرتی انقلاب کی تحریک برپا ہوسکتی ہے، وہ حقیقی انقلابی تحریک ہوگی۔ اس تحریک سے معاشرہ میں ہر سطح پر سماجی فلاح وبہتری کے ادارہ مستحکم ہوں گے، بے بسوں محتاجوں کی خبر گیری کا بہتر نظام متشکل ہوگا اور بُرائی کے خلاف معاشرہ کی نچلی سطح پر دباؤ بڑھتا جائے گا اور منکر کے قلع قمع کے لئے ایسی حکمت عملی اختیار ہوگی، جس سے بڑا شر بھی پیدا نہ ہو اور منکر کے دفع کی صورت بھی پیدا ہو، انشاء اللہ اسی معاشرتی انقلاب سے ہی میدان سیاست میں بھی ایسی طاقتیں مستحکم ہوں گی، جو سیاست کو استحصالی اور مفاد پرست سیاستدانوں اور فوجی وسول نوکر شاہی کی گرفت سے آزاد کرنے کا موجب ہوگی۔

اس وقت جب کہ معاشرہ کا پڑھا لکھا طبقہ عمومی طور پر تصوف کو مسترد کر چکا ہے، ایسی حالت میں بعض اہل تصوف کی طرف سے معاشرہ میں سماجی فلاح کے شعبہ میں ایسے کام سرانجام ہورہے ہیں کہ جنہیں دیکھ کر دل خیرہ ہوجاتا ہے۔

مثلاً حضرت مولانا حکیم اختر صاحب (اب مرحوم) کی طرف سے اختر ٹرسٹ کراچی کے ذریعہ ملک بھر میں نادار لوگوں کے علاج ومعالجہ وغیرہ کی سطح پر بہت بڑا کام ہورہا ہے، اسی طرح حضرت مولانا رشید احمدؒ کے رشید ٹرسٹ کی طرف سے مجاہدین کی امداد اور میدان صحافت میں حق وصداقت کے فروغ کے لئے کئی رسائل واخبارات کے اجراء کا کام، اور ان رسالوں کے ذریعہ باطل اور اہل باطل کے خلاف جدوجہد کو تیز کرنے کا کام بڑی خوش اسلوبی سے ہورہا ہے۔

محترم جناب اشفاق احسان صاحب نے موضوع ایسا چھیڑا ہے کہ دل چاہتا ہے کہ اس پر سیر حاصل بحث کی جائے، لیکن بحث کی طوالت کی وجہ سے اسی پر اکتفا کرتا ہوں۔

یہ مضمون لکھا جا چکا تھا کہ محترم جناب اشفاق احسان صاحب کا دوسرا مکتوب ملا، جس میں موصوف نے کچھ نئے اشکالات کی وضاحت کے لئے بھی فرمایا ہے۔

محترم اشفاق احسان صاحب نے ایک سوال یہ دریافت فرمایا ہے کہ ہمارے ہاں اتنے عارفین کہاں ہیں، جو پندرہ ہزار مدارس کے مدرسین اور شاگردوں کی اصلاح کے لئے زیادہ نہیں تو پانچ فی صد ضرورت ہی پوری کرنے کے لئے کافی ہوں۔

یقیناً زوال پذیر معاشرہ میں اب ایک تو پہلے کی طرح صاحب کمال علمائے ربانی کا خلا ہے، تاہم بہرحال معاشرہ کی استعداد، ضرورت وحالات کی مناسبت سے اب بھی اہل اللہ موجود ہیں۔ ہر وہ شخص جو مربی کی فہرست میں شامل ہے، جو نفس مطمئنہ کا کورس مکمل کر کے کسی مستند بزرگ کا خلافت یافتہ ہے، وہ نفس کی عیاریوں اور مکاریوں سے بڑی حد تک آشنا ہوجاتا ہے اور دوسروں کی نفسی تربیت کے اہل ہوجاتا ہے۔ اس طرح کے مربی الحمدللہ معاشرہ میں اب بھی موجود ہیں۔ ملک میں یقیناً اس طرح کے کافی مربی موجود ہیں۔ اس طرح کا ہر شخص باطن میں سوز وساز اور عشق کی ایسی کیفیات رکھتا ہے کہ جو فرد بھی ایک بار حقیقی طلب اور محبت وعقیدت کے جذبات سے ان سے وابستہ ہوجائے، اس

کے دل میں عشق کی چنگاری بھڑکنا شروع ہوجاتی ہے، اگر ایک مربی سے دس بیس، پچاس ہزار یا ایک دولاکھ افراد بھی وابستہ ہوجائیں تو ان سب کا دل اپنی اپنی استعداد کے مطابق محبت اور عشق کے جذبات سے ہمکنار ہونا شروع ہوجاتا ہے اور ''احسان'' اور نور ایمان اور نور معرفت کے ذریعہ آہستہ آہستہ اس کا معرفت نفس ومعرفت رب کا سفر شروع ہوجاتا ہے۔ بزرگوں کی روحانی قوت کی مثال ریل کی اس طاقتور انجن کی طرح ہے، جو سوسو ڈبوں کو کھینچ لیتی ہے اور ان ڈبوں میں موجود بے شمار افراد کو مطلوبہ منزل تک پہنچاتی ہے۔

محترم جناب اشفاق احسان صاحب نے ایک اشکال یہ پیش فرمایا ہے کہ مجھے بڑے بڑے بزرگوں میں اظہار تفاخر اور عجب کا انداز نمایاں نظر آتا ہے اور وہ چھپائے نہیں چھپتا، مثلاً ملک بھر سے نکلنے والے مختلف دینی رسالوں میں بزرگوں کے نام سے محبوب العلماء والصلحاء حضرت مولانا پیر صاحب جیسے الفاظ ان کے علم اور ان کی اجازت ہی سے لکھے جا سکتے ہیں۔ کیا یہ اپنے منہ میاں مٹھو بننے کی کوشش کے علاوہ بھی کچھ ہوسکتا ہے؟

راقم کی نظر میں مریدوں کی طرف سے بزرگوں کے شان میں غلو کی حد تک قصیدہ گوئی اور آداب کی بجا آوری میں تفریط ایسی چیز ہے، جو بہت ساری غلط فہمیوں کا موجب بنی ہوئی ہے اور ذہین اور سمجھدار افراد کو بزرگوں کے نفسی ونفسیاتی علوم سے دور کرنے کا موجب بن گئی ہے۔ لیکن مریدوں کے اس غلو کو بزرگوں کے اظہارِ تفاخر یا ان کی رضامندی کی علامت قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس کے دو اسباب ہیں۔ ایک یہ کہ سلوک میں داخل ہونے کے بعد فرد جوں جوں آگے بڑھتا رہتا ہے، تجلیات الٰہی کے ذریعہ سالک کی تربیت ہوتی رہتی ہے۔ کبھی جلالی تجلی کا غلبہ ہوتا ہے تو کبھی جمالی تجلیات کا۔ سالک کی شخصیت تجلیات کے زیر اثر اس طرح سفر کرتی رہتی ہے کہ وہ چوبیس گھنٹے جلالی اور جمالی تجلیات کی حالت میں رہتی ہے۔ جلالی تجلیات کا اثر رہتا ہے تو سالک کا نفس کھلنے لگتا ہے اور فرد یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ اس سے گویا دین ودنیا کی ساری نعمتیں سلب کر لی گئی ہیں۔ محبوب کی طرف سے اعراض اور بے رخی کے نتیجہ میں سالک اپنے اوپر اذیت کے پہاڑ محسوس کرنے لگتا ہے اور اس کی دل کی دنیا درہم برہم ہوجاتی ہے، لیکن جلالی تجلیات کے معا بعد جمالی تجلیات کا عکس قلب پر گرنے لگتا ہے۔ جمالی تجلیات کا اثر یہ ہوتا ہے کہ سالک محسوس کرتا ہے کہ محبوب نے اپنے قرب ومعیت کا راستہ کھول دیا ہے، اب اس کے لئے یہ دنیا جنت کا نمونہ بن گئی ہے۔ سالکِ راہ حق پندرہ بیس سال تک قبض وبسط اور جلالی وجمالی تجلیات کی ان حالتوں میں رہ کر جب نفس مطمئنہ کے مقام پر فائز ہوجاتا ہے تو وہ حقیقتاً دعویٰ سے دستبردار ہوجاتا ہے، وہ عاجزی، فروتنی اور فنائیت کی راہ پر آجاتا ہے۔ اس لئے کہ سلوک کے سفر کے دوران وہ دعویٰ، تفاخر، افضلیت اور بڑے پن کے احساسات ونتائج کو بھگت چکا ہوتا ہے کہ جمالی تجلیات کی سلبی کی وجہ سے اس کے دل پر قیامت سے پہلے قیامت برپا ہوجاتی ہے، جب تک وہ توبہ اور آہ وزاری کے ذریعہ فروتنی کی راہ پر نہیں آتا، اس کے قلبی وباطنی حالات درست نہیں ہوتے اور اسلامیت کی راہ پر چلنا اس کے لئے دشوار تر ہوجاتا ہے۔

بزرگوں کی شان میں غیر معمولی قصیدہ گوئی دراصل مریدوں کا اپنا انفرادی فعل ہوتا ہے۔ چونکہ عقیدت اور محبت سے متعلقہ افراد کو بزرگوں سے غیر معمولی روحانی فیض حاصل ہوتا ہے، بزرگوں سے اپنے قلب کے اتصال کی وجہ سے ان کے قلب میں موجود کثرت ذکر کے ذخیرہ کے انوار سالکین کے قلب میں منتقل ہونا شروع ہوجاتے ہیں، جس سے وہ مسرت کے لازوال احساسات سے سرشار ہوجاتے ہیں، اور دنیا مافیہا کے غم سے نجات حاصل کر لیتے ہیں۔ ان احساسات کی وجہ سے وہ محبت وعقیدت کے جذبات میں اعتدال قائم نہیں رکھ پاتے، عقیدت ومحبت کے غلو کے اس طرح کے مظاہر بزرگوں کے لئے خود بڑی پریشانی کا باعث بن جاتے ہیں۔

دراصل اہل اللہ سے استفادہ کی راہ میں عقل سیکڑوں بہانے بناتی ہے۔ عقل کے ایک دلیل کا توڑ ہوجاتا ہے تو وہ دس نئے دلیل سامنے لاتی ہے، اہل اللہ کے معرفت نفس اور معرفت رب کے علوم سے مشاہداتی آگاہی کے لئے عقل کو ایک طرف رکھے بغیر چارہ

کار ہی نہیں ہے۔ ہاں عقل جب معرفت کے انوار سے ایک حد تک بہرہ ور ہونا شروع ہوجاتی ہے۔ اس کے بعد عقل کے بھرپور استعمال کے جو نتائج نکلتے ہیں، وہ باعث برکت ہوتے ہیں۔

آخر میں یہ عرض کرنا بھی ضروری ہے کہ تصوف واحسان کا ادارہ اصلاح نفس، تہذیب نفس اور محبت الٰہی اور انوار الٰہی کے اخذ کے لئے کوئی آخری ادارہ نہیں۔ اور اصلاح محض اسی ادارہ سے وابستہ نہیں ہے، بلکہ اللہ کے بہت سارے ایسے بندے ہر دور میں موجود رہے ہیں اور آج بھی ہیں، جن کے فطرت سلیمہ کے اجزاء بڑی حدتک محفوظ رہتے ہیں اور جنہیں خود احتسابی اور اپنی اصلاح کی غیرمعمولی فکر دامنگیر رہتی ہے، اس طرح کے افراد قرآن اور ذکر واذکار سے مستقل تعلق قائم کرکے اور اپنے نفس کا باریک بینی سے مستقل احتساب کرکے بڑی حد تک اپنی اصلاح کرنے میں کامیاب رہتے ہیں، ایسے افراد کا قرآن وسنت اور ذکر واذکار سے تعلق دوسروں کو سنانے کی غرض سے نہیں ہوتا، بلکہ ان کا اولین مقصد اپنی اصلاح ہی ہوتا ہے۔ اپنی اصلاح کے قابل ذکر مرحلہ کے بعد ہی وہ دعوۃ کے فریضہ کی سرانجامی کے لئے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ اس طرح کے افراد بھی اہل اللہ کے زمرہ میں شامل ہوتے ہیں۔ لیکن اتنا فرق ضرور ہوتا ہے کہ وہ نفس کے تجزیاتی وتجرباتی مراحل سے نہ گذرنے اور جلالی وجمالی تجلیات کے عکس اور قبض وبسط کی وسیع دنیا سے عدم آشنائی کی وجہ سے دوسروں کی تربیت کرنے اور انہیں نفس مطمئنہ کے مراحل سے گزارنے کی صلاحیت سے بہرہ ور نہیں ہوتے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس طرح کے اہل اللہ جو نفسی خرابیوں سے بڑی حد تک محفوظ ہوں اور جو اخلاق حسنہ کے حامل ہوں، موجودہ دور میں خال خال ہی ہیں۔ اس لئے کہ بدقسمتی سے معاشرہ مفاسد سے اتنا بھرپور ہے کہ وہ عام طور پر افراد کی فطرت سلیمہ کے اجزاء کو ضایع ہی کردیتا ہے اور ان کی نفسیات کو مفاسد سے بھر دیتا ہے۔

ملت کا تہذیبی وتربیتی نظام

اس کی خصوصیات

اور ہمارے لئے بچاؤ کی صورت

ہمارے تربیتی نظام (خانقاہی اداروں) کی سب سے اہم خصوصیت یہ تھی کہ وہ اللہ کے بندوں کو جو اللہ سے روٹھے ہوئے تھے، انہیں اللہ سے ملاتے تھے، اللہ سے اس وصل کے نتیجہ میں ان پر گرنے والے غموں کے سارے پہاڑ ٹل جاتے تھے اور وہ ایک نئی پاکیزہ زندگی سے بہریاب ہوتے تھے اور وہ سارے نفسیاتی واخلاقی وروحانی بحران (جس سے اس وقت ہمارا معاشرہ دوچار ہے) سے محفوظ تھے۔

اس تربیتی نظام کی دوسری بڑی خصوصیت یہ تھی کہ یہ معاشرہ کے لئے رفاہی خدمت کا ذریعہ تھا۔ خانقاہوں میں افراد کو کھانا مفت میں دستیاب ہوتا تھا، افراد چاہے ایک سال رہیں یا دوسال یا دس سال، کھانے کا انتظام خانقاہوں کی طرف سے اعزازی طور پر ہوتا تھا۔ اور خانقاہوں سے وابستہ خوشحال مریدوں پر مفلوک الحال افراد سے مالی معاون کرنا ان کی ذمہ داریوں میں شامل تھا۔

ہمارے اس تربیتی نظام کی تیسری خصوصیت یہ تھی کہ اس سے معاشرے کو ایسے افرادکار فراہم ہوتے تھے، جنہیں خلافت دے کر فرمایا جاتا تھا کہ اب تمہاری مزید روحانی ترقی اللہ کی مخلوق کی خدمت سے ہوگی، چنانچہ وہ دل وجان سے لوگوں کی خدمت کرتے تھے، اس طرح معاشرہ میں بے یارومددگار افراد کی پرسانِ حالی اور ان کی تربیت کا ایک

خودکار نظام قائم تھا۔

اس نظام کی چوتھی خصوصیت یہ تھی کہ خانقاہ کا سربراہ وہ ہوتا تھا، جو دنیا کے اپنے حصہ سے بڑی حد تک دستبردار ہوتا تھا۔ یعنی بزرگ خود زہد وفقر کا صاحب ہوتا تھا، دنیا سے استفادے کا اس کا میلان ورجحان مضمحل ہوجاتا تھا، سارے اکابر بزرگان کی تاریخ یہی کچھ بتاتی ہے۔ سبب یہ ہے کہ ان کے دل سے دنیا کی ہیبت ومحبت نکل چکی تھی۔ حضرت نظام الدین اولیاء کے وصال کے وقت ان سے دریافت فرمایا گیا کہ اب آپ کی خانقاہ (جس میں مالِ فتوحات ہر وقت آتا ہے) اس کا نگران وذمہ دار کون ہوگا تو آپ نے فرمایا، وہ ہوگا جو دنیا کے اپنے حصہ سے دستبردار ہوگا۔

ہم نے خود اپنی زندگی میں متعدد ایسے بزرگ دیکھے ہیں، جو دولت ودنیا کے بارے میں اسی روش پر گامزن تھے۔ آج بھی ملک کے کونوں کھدروں میں اس طرح کے درویش موجود ہیں، جو ہمارے اس تہذیبی تسلسل کے وارث وامین ہیں۔ لیکن چونکہ مادیت پرستی کی طوفانی لہروں نے دلوں اور ذہنوں پر دولت کے نقوش مستحکم کردیئے ہیں، اس لئے ہمیں اس طرح کے درویش وفقیر منش شخصیتوں کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ ہمیں تو بزرگی کے نام پر ایسی شخصیتیں مطلوب ہیں، جو اکابر بزرگوں کے خطوط سے ہٹ کر، شان ومان کی زندگی کے عادی ہوں، جو جاگیرداروں اور سرمائیداروں کی طرح حفاظتی دستوں کے گھیراؤ میں رہتے ہوں۔ عام افراد اور مریدوں سے ملنے کیلئے ان کے دروازے بند ہوں (وہ حیلوں بہانوں سے اس طرح کی جاگیردارانہ طرز زندگی کا جواز تراش لیتے ہیں) اس طرح بزرگی کے نام پر اس طرح کی شخصیتیں (جو ہمارے مزاج سے مطابقت رکھتے ہوں) وہ ہمیں وافر مقدار میں دستیاب ہیں۔

لیکن یہ نکتہ یاد رکھنا چاہئے کہ ہمارا سارا قومی وملی بحران جو پیدا ہوا ہے، وہ دولت اور دنیا پر فدا ہونے کی اداؤں اور دولت پرستی کے میلانات ورجحانات کے غلبہ کی وجہ سے ہی پیدا ہوا ہے۔ ارتکاز دولت، قساوت قلبی، سنگ دلی، اپنی دولت میں غریب ومستحق افراد کو حصہ دارا نہ بنانے اور مظاہر دولت کی وجہ سے لوگوں میں دولت اور زیب وزینت کے سامان کی ریس پیدا ہونے جیسی سارے بیماریاں اور اس طرح کے سارے مفاسد اسی دولت پرستی کے رجحان ہی کا خاصہ اور نتیجہ ہیں۔

اس بحران سے بچاؤ کی صورت اپنے تہذیبی وتربیتی نظام کی طرف واپسی اور اس نظام کی طاقتور صورت میں ازسرنو بحالی، اہل علم واہل دانش اور معاشرے کے مؤثر طبقات کی اس نظام سے وابستگی کے علاوہ اور کوئی موجود نہیں ہے۔

ہم قومی وملی واجتماعی زندگی کو بڑھتے ہوئے بگاڑ سے بچانے کے لئے کتنے ہی ہاتھ پیر ماریں، کتنی ہی تدابیر اختیار کریں اور منصوبہ بندی کریں، نتیجہ دھات کے پات ہی ہوگا۔ اور قومی وملی بحران سنگین سے سنگین تر ہوتا جائے گا اور ادارے اور جماعتیں مفاسد سے بچ سکیں، ممکن نہیں۔

قدرت نے ہمیں ایسے مقام پر لا کھڑا کیا ہے، جہاں ہمارے لئے راہ فرار کے سارے راستے مسدود ہوگئے ہیں، اپنے فطری تربیتی وروحانی نظام سے وابستگی اختیار کرکے بہتاتِ دنیا اور کثرت دنیا کے ہیذان اور جنون سے بچ کر، دنیا کو اس کی ضرورت کے تحت اہمیت دینا ہوگی، افرادِ ملت میں یہ صلاحیت اپنے تہذیبی وتربیتی نظام سے وابستگی کے نتیجہ میں ہی پیدا ہوگی یا پھر ہمیں قدرت کی طرف سے بڑھتی ہوئی نفسیاتی، ذہنی، اخلاقی اور روحانی بیماریوں کی شکل میں سزا کیلئے تیار ہونا ہوگا، ان دو صورتوں کی علاوہ تیسری کوئی صورت موجود نہیں۔

اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ ضرورت کے تحت دنیا کے لئے جدوجہد کرنا ضروری ہے، نہ صرف اس کی ممانعت نہیں ہے، بلکہ اس کی تاکید ہے کہ اپنے اہل وعیال کی کفالت کی جدوجہد دینی فریضہ ہے، لیکن فساد کی اصل جڑ حب دنیا وحب جاہ ہے، اس

سے بچنے کے لئے صاحبان دل اور صاحبان فقر کی صحبت اور ان کے تربیتی نظام سے وابستگی ناگزیر ہے۔

البتہ صاحبانِ فقر وصاحبانِ زہد جو دنیا کے حوالے سے اپنے حصہ سے دستبردار ہوتے ہیں اور وہ دنیا سے کم سے کم استفادہ کرتے ہیں، وہ ان کی امتیازی نمایاں خصوصیت ہے، کہ ذکر وفکر کے غیر معمولی مجاہدوں کے نتیجہ میں فقر ان کی مزاج میں راسخ ہوجاتا ہے، یہی فقر محمدی ہے، جس پر حقیقی درویش گامزن ہوتے ہیں، وہ روحانی اور ایمانی قوت کے اعتبار سے اس مقام پر فائز ہوتے ہیں، جہاں ان کے لئے فقر وزہد کی حلاوت سے بڑھکر کوئی حلاوت نہیں ہوتی۔ ان کے لئے سادہ اور مختصر سی روٹی اور ایک آدھ جوڑے کپڑے اور سادہ سا مکان ہی راحت کا سامان ہے۔ ان کا دل ذکر کے نور سے اس قدر شاداب ہوتا ہے کہ ذکر انہیں دنیا مافیھا سے بے نیاز کردیتا ہے۔ اس طرح کی شخصیتوں کی صحبت سے زہد وفقر کے کچھ اجزاء لینا اور حب جاہ وحب مال جیسے امراض کے علاج کی دوائی لئے بغیر کوئی چارہ کار ہی نہیں ہے۔

ہماری سیاست ومعاشرت

داخلی بحران کی زد میں

آج ہماری ملی، قومی واجتماعی زندگی کا ہر شعبہ بحران سے دوچار ہے اور معاشرے کے سارے مؤثر طبقات اپنے کردار اور اپنی روش سے اس بحران میں اضافہ کا ذریعہ بن رہے ہیں۔

حکمرانوں کو دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ ان کے سامنے ایک ہی بڑا ہدف ہے، جو ان کی زندگی کے نصب العین کی حیثیت اختیار کر چکا ہے، وہ ہدف یہ ہے کہ قومی تعمیر کے منصوبوں کے لئے مختص رقم میں لوٹ مار یا دوسرے ذرائع سے جتنی بھی دولت جمع کی جاسکتی ہو، کی جائے۔

سیکریٹری سطح کے افسران سے لے کر نچلی سطح کے افسران تک کو دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ ان پر بھی یہی جنوں سوار ہے کہ، رشوت، سرکاری ٹھیکوں پر کمیشن اور دوسرے ذرائع سے ہر ممکن حد تک دولت حاصل کی جائے۔

سیاستدانوں کی باہمی لڑائی کا سبب بھی صرف ایک ہی ہے کہ کسی طریقہ سے اقتدار کی کرسی پر فلاں جماعت کی قیادت کی بجائے ہم فائز ہوجائیں، تاکہ حکومتی وسائل اور قومی ذرائع آمدنی ان کے اختیار میں ہوں اور وہ اپنی مرضی کے مطابق ان میں تصرف کرکے زیادہ سے زیادہ مال ودولت سے بہرہ ور ہوسکیں۔

ڈاکٹروں اور وکیلوں کو دیکھیں تو نظر آئے گا کہ وہ لوگوں کی جیبوں پر ڈاکہ ڈال کر جلد سے جلد امیر سے امیر تر بننے کی دوڑ میں شریک ہیں، معائنہ فیس، ٹیسٹ رپورٹوں میں کمیشن دواؤں کی کمپنیوں سے ملی بھگت اور آپریشن وغیرہ کی صورت میں ماہر ڈاکٹر روزانہ لوگوں سے لاکھوں روپے لوٹ رہے ہیں اور غریب عوام کا خون نچوڑ کر اپنے جذباتِ ہوس

کی تسکین کا سامان کر رہے ہے، صنعت کاورں اور تاجروں کو دیکھیں تو وہ اشیائے صرف کی تیاری، پیداوار میں ملاوٹ، معیار کی کمی اور اشیاء کی فروخت سے کئی گنا زیادہ منافع کے ساتھ ٹیکس چوری کے ذریعہ کروڑ پتی اور ارب پتی بن رہے ہیں۔

دولت کے اس جنوں نے پوری قومی زندگی کو ہلا کر رکھ دیا ہے، لوگ بھوک سے بلبلا رہے ہیں۔ زندگی کے ہر موڑ پر عام لوگوں کی پرسانِ حالی کا نظام ختم ہوگیا ہے، روڈ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہیں، نکاسیٔ آب کا نظام تباہی سے دوچار ہے، سرکاری دفتروں سے وابستہ چھوٹے چھوٹے کاموں کے سلسلے میں لوگ برسوں تک دفتروں کے چکر کاٹنے پر مجبور ہیں۔

ہر شعبہ سے وابستہ کھانے کمانے اور لوٹ مار کرنے والے افراد غیر محسوس طور پر منظّم جماعت کی صورت اختیار کر چکے ہیں کہ وہ ایک دوسرے کو ناجائز رقوم دینے دلانے میں معاون بنیں گے اور ایک دوسرے کو ہر ممکن حد تک تحفظ فراہم کریں گے۔

اس صورتحال کو دیکھ کر یہ کہنا بجا ہوگا کہ ہمارے جدید تعلیم سے وابستہ سارے مؤثر طبقات قوم وملت کے لئے بڑے ڈاکوؤں کی صورت اختیار کر چکے ہیں، ڈاکو تو کبھی کبھار روڈ بلاک کرکے یا مالداروں کے گھروں کا گھیراؤ کرکے چند لاکھ روپے کا سامان لوٹ لیتے ہیں، لیکن جدید تعلیم کے حامل یہ مہذب ڈاکو تو اپنی فنی وماہرانہ صلاحیت، سیاسی وانتظامی تجربہ اور معاشرہ میں حاصل بہتر پوزیشن کی وجہ سے افرادقوم سے روزانہ کروڑہا ارہا روپے لوٹ رہے ہیں۔

اس طرح ہمارے یہ مہذب ڈاکو قانون شکن ڈاکوؤں سے زیاہ ملک میں تباہی وبربادی کا موجب بن رہے ہیں، عام ڈاکو تو مجرم کی حیثیت سے پکڑے بھی جاتے ہیں، روپوش ہونے کے باوجود انتظامیہ پوری حرکت میں آ کر، ان کے فرار کے راستے مسدود کردیتی ہے، لیکن ہمارے یہ مہذب ڈاکو قوم کے سرتاج بنے ہوئے ہیں، وہ قانون کی گرفت سے آزاد ہیں، اس لئے کہ قانون ان کی ملی بھگت سے بنایا ہوا ہوتا ہے، وہ قانون انہی کے تحفظ کا ذریعہ بن جاتا ہے، ویسے بھی دولت کا کھیل ہی ایسا ہے کہ بڑے سے بڑا قانون ان کے سامنے بے بس ہوجاتا ہے۔

قوم اور ملت کی اس حالت زار کے اسباب پر غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ یہ ساری صورتحال ہمہ گیر وہمہ جہتی داخلی (باطنی) بحران کی وجہ سے ہی پیدا ہوئی ہے۔ وہ باطنی بحران یہ ہے کہ ہمارا تعلیمی وتربیتی نظام معاشرہ کو ایسے سیاستدان، ایسے افسران، ایسے صنعت کار اور ایسے ڈاکٹر وغیرہ فراہم کررہا ہے، جو حرص وہوس کے مریض ہیں اور جو حب جاہ وحب مال اور مادی بتوں کے سامنے سجدہ ریزی کرنے کی نفسیات کے حامل ہیں، یہ وہ داخلی بحران ہے، جسے ہمارا تعلیمی نظام فروغ دے رہا ہے۔

جب تک اس داخلی بحران کا شعور وادراک پیدا نہ ہوگا، اس وقت تک ہماری سیاست، ہماری معیشت ومعاشرت اور ہمارے انتظامی ڈانچہ میں بہتری کی صورت پیدا ہو، ممکن نہیں۔

حرص وہوس، دنیا پر فدائیت کی ادائیں، حب جاہ وحب مال کے امراض ایسے سنگیں امراض ہیں کہ ماضی کی بہت ساری قومیں انہی امراض کی وجہ سے ہی تباہی، زوال اور اللہ کے عذاب کا شکار ہوئیں۔

اگر ہم چاہتے ہیں کہ اپنے اجتماعی وقومی نظام میں بہتری کی صورت پیدا ہو اور ہم قوموں کے درمیاں مہذبانہ حیثیت سے زندگی گذارنے کے اہل ثابت ہوں تو اس کے لئے ضروری ہے کہ ہم اپنے تعلیمی نظام کی تشکیل اس طرح کریں، جس سے افراد کے باطن کی بہتر اور پاکیزہ بنیادوں پر تعمیر کا کام ہو سکے اور وہ باطن میں موجود طاقتور بتوں کی پرستش سے بچکر، محض اللہ کے لئے جینے اور اللہ کے لئے مرنے کے سلیقہ سے آشنا ہوسکیں اور اس صلاحیت سے بہرہ ورہ ہوسکیں، یہی واحد صورت ہے، جس سے ہم ریاست، اور معاشرے کو اپنی پاکیزہ تہذیب کے شایانِ شان حکمران، افسراں، صنعتکار، تاجر، ڈاکٹر وکیل اور سماجی کارکن وغیرہ فراہم کر سکتے ہیں۔ اس کی دوسری کوئی صورت موجود نہیں، اس لئے

کہ نظام تعلیم وتربیت کے ذریعہ اگر ایک بار مادی بتوں کی ہیبت اور نفس پرستی کی قوتوں کی پرستش کے خطوط مستحکم ہوگئے تو ان خطوط کو ہٹا کر، مزاج میں نئے بہتر وپاکیزہ خطوط کو مستحکم کرنا غیر معمولی طور پر دشوار ہوتا ہے۔

واضح ہو کہ اس سلسلہ میں اہل مغرب سے رہنمائی ہمارے لئے مفید ثابت نہیں ہوگی، اس لئے کہ ہر ملت اور ہر قوم کی اپنی تہذیبی بنیادیں ہوتی ہیں۔ ان کا سارا اجتماعی نظام انہی بنیادوں پر متشکل ہوتا ہے، اس سے ہٹ کر نہیں۔ مغرب کی تہذیبی بنیادوں میں ایک ہی چیز کارفرما ہے، وہ ہے مادی دنیا کو بہتر سے بہتر بنانے کا داعیہ وتقاضا۔ توحید، رسالت، آخرت، دل، روح، فطرت سلیمہ، ضمیر کی قوت، یہ ساری چیزیں جو ہماری پاکیزہ تہذیب کا حصہ ہیں، بلکہ اس کی بنیاد ہیں، مغربی تہذیب ان جوہروں سے نہ صرف محروم ہے، بلکہ اہل مغرب اس اعتقادی نظام کا منکر ہے۔ اس لئے مغرب سے رہنمائی لینے کا مطلب اپنے داخلی بحران میں اضافہ کرنا اور اپنی اجتماعی زندگی کو سنگین سے سنگین بحران سے دوچار کرنا ہے۔

مغرب کے مفکرین خود اپنے معاشرے کی حالت زار کا رونا رو رہے ہیں کہ سرمایہ دارانہ نظام نے مغربی معاشرہ کو خود غرضی، مفاد پرستی اور مادیت پرستی کی فضا سے بھر دیا ہے۔ شفقت، محبت، رواداری، رشتۂ داری کے تقدس وغیرہ کو ختم کردیا ہے۔ وہاں انسان کی حالت یہ ہوگئی ہے کہ کتوں سے تو وفاداری کی امید قائم ہوتی ہے، اپنے شوہر اور اپنے بھائی وغیرہ سے اس کی امید نہیں ہوتی۔ جس مغرب کی داخلی طور پر یہ حالت ہو، وہ داخلی نوعیت کے بحران کے خاتمہ میں ہماری کیا مدد کرسکتا ہے؟ یہ نہایت اہم نکتہ ہے جس پر غور وفکر کی ضرورت ہے۔

اللہ کی محبت اور زندگی پر پڑنے والے اس کے اثرات

انسان، انس ومحبت سے عبارت ہے، یہ محبت اس کی فطرت کا سب سے طاقتور داعیہ (تقاضا) ہے، پاکیزہ فطری محبت کی راہ میں جب رکاوٹیں ڈال دی جاتی ہیں تو یہ محبت یا تو ذاتی اغراض کی محبت میں تبدیل ہوجاتی ہے یا پھر کسی مادی تصور کی صورت اختیار کر جاتی ہے یعنی وطنیت یا قومیت کے نظریے سے محبت یا کسی صاحب حسن و صاحب صلاحیت شخص کی صلاحیتوں کی وجہ سے اس سے محبت وغیرہ میں تبدیل ہوجاتی ہے۔

جب کہ فطری اور حقیقی محبت وہی ہے، جو فرد کی محبوب حقیقی یعنی اللہ سے ہوتی ہے۔ یہ محبت اللہ کی ذات سے اس کی ذات کے تقدس اور برتر وبالا ہستی، اس کی اور ساری کائنات کی خالق ہستی اور سارے حسن کی منبع ذات ہونے کی وجہ سے یہ ذاتی نوعیت کی محبت ہے، جو انسان کے خون میں گردش کرتی رہتی ہے اور یہ فطرت کا ایسا ناگزیر تقاضا ہے، جس سے انسان کے سارے جذبات، ساری حسرتیں اور سارے ارمان وابستہ ہیں۔ اللہ کی ذات سے فرد کی یہ محبت ایسی ہے، جو غالب ہونے کی صورت میں فرد کے دل کو دوسری محبتوں سے فارغ کردیتی ہے، ذات کی اس محبت کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ محبّ، محبوب اور محبت تینوں کے درمیاں فاصلے ختم ہوکر، وہ یکساں ہوجاتے ہیں **من کان اللہ کان اللہ لہ** (جو اللہ کا ہوجاتا ہے اللہ اس کا ہوجاتا ہے) کی صورت ہوجاتی ہے۔ یہ وہ مقام ہوتا ہے، جہاں محبوب کی مرضی بندہ کی مرضی بن جاتی ہے۔ محبوب کی اطاعت، دل وجان کا حصہ بن جاتی ہے۔ یہی وہ محبت ہے، جس سے انسانی شخصیت کی ساری خوشیاں وابستہ ہیں اور یہی طاقتور محبت، فرد کو اللہ کے بندوں سے بہتر اور بے غرضانہ محبت کے تعلقات استوار کرنے کا ذریعہ بنتی ہے، توحید کا استحکام اسی محبت سے وابستہ ہے، دین وشریعت کی عمارت بھی محبوب حقیقی کی اسی محبت پر قائم ہے۔

اللہ کی ذات سے یہی محبت فرد کو دنیا میں خلافت کا استحقاق عطا کرتی ہے۔ قرآن

میں مومنوں کی یہی علامت وخصوصیت بیان کی گئی ہے **وَالَّذِيْنَ آمَنُوْا أَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰه**. اللہ کی جس ذاتی محبت سے دین ودنیا کی جملہ سعادتیں وابستہ ہوں، اس محبت کا حصول اور اس کے ارتقائی مراحل طے کرنا، ایسا کام ہے، جو دین وشریعت کے لئے نصب العین کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی لئے اللہ کی محبت کے رازدانوں کا کہنا ہے کہ سارے انبیاء کرام کی بعثت کے مقصد کو اگر مختصر الفاظ میں بیان کرنے کے لئے کہا جائے تو یہی کہا جائے گا کہ انسانی فطرت میں محبوب حقیقی سے ودیعت شدہ پاکیزہ محبت، جسے گھر کا ماحول اور تعلیم وتربیت کا ماحول دبا دیتا ہے، اسے بیدار کرکے محبوب حقیقی کی اطاعت کے ذریعہ اسے ارتقائی صورت دی جائے۔

اللہ نے دل کی بناوٹ اپنے نام پر رکھی ہے، اس لئے محبوب حقیقی کے لئے دل کی چاہت بے پناہ ہے، بلکہ نہ ختم ہونے والی ہے۔ جب دل کو اللہ کے نام کے تکرار کے ذریعہ اس کے انوار حسن کی خوراک دی جاتی ہے تو دل کی ایک حد تک تشنگی دور ہونے لگتی ہے، اس کی تشفی ہونے لگتی ہے۔ دوسری صورت میں دل، نفس کے تابع ہوکر، مادی حسن پر فریفتہ ہونے لگتا ہے، اور نفس اسے مادیت کی دلدل میں پھنسا دیتا ہے۔ مادیت کی دہ دلدل ایسی ہے کہ اس سے پھر نکلنے کی صورت کا پیدا ہونا انتہائی دشوار ہوجاتا ہے۔

دنیا میں پیدا ہونے والا سارا فساد دل کی اس تشنگی کی وجہ سے ہی پیدا ہوتا ہے، جو اس کے حقیقی وپاکیزہ جذباتِ محبت کی تسکین کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرنے اور اسے مادی محبت کی راہ پر لگانے کی صورت میں رونما ہوتا ہے۔

دل چونکہ ایک جوہری چیز ہے، یعنی وہ مادہ سے ماورٰی چیز ہے، بلکہ وہ محبوب حقیقی کے ساتھ عشق ومحبت کا ایک نہ ختم ہونے والا شعلہ ہے، جو عشق سے ہی فروزاں رہتا ہے، محبوب کے ساتھ دل کا یہ عشق دنیا اور موت کے بعد اور قیامت میں مسلسل ارتقائی مراحل طے کرے گا اور عشق کے اس شعلہ کی تسکین جنت میں محبوب حقیقی کے دیدار کے علاوہ کسی اور چیز سے ہونا ممکن ہی نہیں۔

وہ لوگ جو محبوب کے ساتھ دل کے عشق کو بیدار کرکے ذکر وفکر اور مخلصانہ عبادت کے ذریعہ اسے ارتقائی صورت دینے کے کام سے غافل ہیں، جو سراپا مادی زندگی میں مستغرق ہیں، وہ ہر اعتبار سے قابل رحم ہیں، ان کی رحم کی یہ حالت ایسی ہے، جس پر جس قدر صدمہ وتاسف کا اظہار ہو، وہ کم ہے، اس لئے کہ محبوب حقیقی کے بغیر دل کی حالت مفلس وقلاش کی سی ہوجاتی ہے، ایسا دل زندگی کے مسائل سے عہدہ برآ ہونے کے سلسلہ میں حوصلہ، ہمت اور خوداعتمادی سے محروم ہوتا ہے، وہ قدم قدم پر یاس کا شکار ہوجاتا ہے، وہ اعتدال اور ٹھہراؤ جیسی صفات سے بے بہرہ ہوتا ہے، ایسے دل کی حالت اس شخص کی سی ہوجاتی ہے، جو تنکہ اور پتہ لگنے سے ہل کر رہ جاتا ہے، موت کے وقت، موت کے بعد اور قیامت میں اس دل کی جو حالت ہوسکتی ہے، وہ ناقابل بیان اذیت کی حالت ہے۔

اللہ کی محبت کی بات کو سادگی سے لینا اور اسے اہمیت نہ دینا اور اس سلسلہ میں سنجیدگی اختیار نہ کرنا، اپنے اوپر ظلم عظیم ہے، اور قیامت خیز حالات سے گذرنے کے مترادف ہے۔

نفسی قوتوں کو شکست دے کر محبوب حقیقی کا قرب حاصل کرنے اور عشق ومحبت کے انعام اور فیضان کا مصداق ہونے کے لئے جن چیزوں کی ضرورت ہے، وہ درج ذیل ہیں۔

(۱) اسلامی شریعت پر پوری ہمت واستقامت سے گامزن ہونے کی کوشش کی جائے، خوداحتسابی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہر اس عادت کو چھوڑنے کی سعی کی جائے، جو شریعت کے خلاف ہے اور ہر سنت پر عمل کرنے کے لئے فکرمندی اختیار کی جائے۔ شریعت کی یہ راہ بظاہر جتنی بھی دشوار نظر آئے، ساری قوتیں مجتمع کرکے اس دشواری پر قابو پانے کی کوشش کی جائے۔ ایسا کرنے سے اللہ کی محبت کا رنگ آہستہ آہستہ غالب ہوتا جائے گا۔

(۲) اللہ کی غریب، بے کس اور محتاج مخلوق کی مدد وخدمت کو وظیفہ بنایا جائے، اس خدمت کے لئے اپنے آپ کو ہر ممکن طریقہ سے آمادہ کرنے کی کوشش کی جائے۔ خدمت کا یہ کام ایسا ہے، جس کی وجہ سے محبوب کی طرف سے عطا ہوتی ہے اور فرد وافراد کی یہ ادا اللہ کی محبت کا ذریعہ بننے لگتی ہے۔

(۳) ذکر وفکر، عبادت اور قرآن سے اپنا تعلق مستحکم سے مستحکم تر کیا جائے جب

تک محبت کی راہ وا نہ ہوجائے اور ایک حد تک اصلاح نفس کا عمل نہ ہوجائے، تب تک دوسروں کی اصلاح کا کام ہاتھ میں نہ لیا جائے۔ اس لئے کہ حکیمانہ صلاحیت پیدا ہونے اور نفس کی کچھ تہذیب ہونے سے پہلے دوسروں کی اصلاح کے کام کو وظیفہ بنانے سے دعویٰ اور تکبر پیدا ہونے اور اس سے امت میں تقسیم پیدا ہونے کا خطرہ لاحق ہے۔

ایک اہل اللہ کا یہ قول بہت اہم ہے کہ جب تم مخلوق کو دعوت دینے کا عزم کرو تو پہلے خود کو دعوت دینا، اس لئے کہ جب تمہیں کوئی دوسرا دعوت دے تو تم اس کو ناپسند کرتے ہو، جب تک تم خود کو دعوت دینے والے نہیں ہوگے، اس وقت تک دعوت دینے والے نہیں بن سکتے۔

(۴) اہل اللہ کی صحبت اختیار کی جائے اور اس صحبت کو معمول بنایا جائے۔ اس صحبت کے ذریعہ ذکر وفکر کی مشق بھی پختہ ہوتی جائے گی تو ساتھ ساتھ آہستہ آہستہ پرانی فاسد عادتوں سے نجات کی صورت بھی پیدا ہوتی جائے گی، اسلامی شریعت پر عمل پیرا ہونے کی استعداد بھی آتی جائے گی۔ باطنی بُرائیوں کا ادراک اور ان کے ازالہ کے صورت بھی پیدا ہوتی جائے گی۔

اہل اللہ کی صحبت سے اللہ کی محبت کا رنگ غالب سے غالب تر ہوتا جائے گا۔

فرد کو یہ نکتہ اچھی طرح سمجھنا چاہئے کہ وہ اللہ کی جس محبت کی خاطر مادی ترقی اور دولت کو ترجیح دے رہا ہے، یہ دولت آفت ہے آفت، جب فرد میں دولت کی محبت اور اس کی کشش پیدا ہوجاتی ہے تو یہ وقت کو اس طرح برباد کرتی ہے کہ موت تک فرد ہوش وحواس میں نہیں رہتا، فرد پر حالت جنوں طاری رہتی ہے، نت نئی مادی سرگرمیوں اور مادی زندگی کی ترقی کے نئے نئے امکانات کی ہوس اسے مجنون وار بنا دیتی ہے۔

دولت کا یہی جنون دوسروں کی حق تلفی، قساوت قلبی، سنگ دلی اور دولت پر سانپ بننے کی نفسیات، بلند سے بلند تر معیار زندگی اور آخرت کی زندگی سے بے فکری جیسی بہت ساری خرابیاں اپنے ساتھ لاتا ہے۔

اگر قناعت، سادگی اور تھوڑے پر راضی رہنے کی زندگی اختیار کرکے، اللہ کی راہ محبت اختیار کی جائے تو اللہ، سکون وسکینت کے ساتھ رزق، وقت، اور علم وغیرہ ہر چیز میں برکت عطا فرماتے ہیں۔

ویسے بھی فرد کو جو روزی ملنی ہے وہ تو مل کر رہے گی۔ دولت کی فکر کو مسلط کرکے، زیادہ روزی کے لئے ساری توانائیوں یا بیشتر توانائیوں کا استعمال لاحاصل ہے، اس لئے کہ روزی کی ایسی جدوجہد اپنے ساتھ نئی نئی آفتیں لاتی ہے۔

دل کی تشفی وتسکین کی واحد صورت اللہ کی محبت کی راہ ہے، دوسری صورت میں اگر دل کو کائنات میں موجود سارے حسن کے مناظر ومظاہر بھی عطا ہوں اور اور ساری دنیا کا خزانہ بھی حاصل ہو تو اس سے اس کی حسرت ناتمام ہی رہے گی اور موت کے بعد دل کو مادی جسم کو جائز وناجائز ذرائع سے آسائشیں فراہم کرنے اور مادی حسن پر فدائیت کی وجہ سے آتش کے شعلوں سے گذرنا ہوگا اور اس سے بچاؤ کی صورتیں مسدود ہوجائیں گی۔ **تَطَّلِعُ عَلَى الْأَفْئِدَةِ** (آگ دل کا گھیراؤ کرے گی)۔

حقیقت یہ ہے کہ اللہ سے محبت کی زندگی سے جو لذتیں اور مسرتیں وابستہ ہے، اگر افراد کو ان لذتوں کا معمولی سا ادراک بھی حاصل ہوجائے تو وہ مادی زندگی کی ان ساری خوشیوں کو اللہ کی اس محبت پر نشاور کرسکتا ہے۔ بلکہ مادی زندگی کی ساری خوشیاں اس کے لئے اللہ کی محبت کے مقابلہ میں ذرہ کی حیثیت بھی نہیں رکھتی، اللہ ہمیں اپنی محبت سے آشنا دل عطا فرمائے، تاکہ ہم اس کی محبت کی راہ پر ہر چیز کو نشاور کرتے ہوئے تیز رفتاری سے چل سکیں، تاکہ اس محبت میں آخرت میں ارتقا پر ارتقا کی سعادت حاصل ہو سکے۔

اللہ کی محبت سے محروم دل کو جہاں اس دنیا میں ہزارہا صدموں سے گرنا پڑتا ہے، وہاں آخرت میں اس سے ہزارہا گنا صدموں سے گذرنا پڑے گا، غفلت سے بیدار ہونے اور سنبھلنے کی ضرورت ہے۔

زندگی ۔ مادی خوشحالی

اور صاحبان دل

اہم تجزیہ

اللہ محبوب، اپنے محبوں (چاہنے والوں) پر دنیا کی حقیقت اور اس کی اصلیت کو منکشف کردیتا ہے کہ اس کی مثال سانپ کی اس کھال کی طرح ہے، جو بظاہر جاذب نظر ہے، جب کہ اس کے اندر زہر پوشیدہ ہے، اور اس کے چھونے سے موت واقع ہوسکتی ہے۔ یا اس کی مثال دھوکے کی اس بڑی دیوار کی سی ہے، جو بغیر بنیاد کے ہے۔ اس کے سایہ میں بیٹھنے سے وہ گرکر، فرد کی ہلاکت کا سبب بن سکتی ہے یا دنیا کی مثال سایہ کی سی ہے، جس کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔

دنیاوی زندگی کی اس حیثیت کے منکشف ہونے کی وجہ سے حقیقی اہل اللہ کے دل، دنیا وسامانِ دنیا کے حوالے سے سرد ہوچکے ہوتے ہیں۔ وہ دنیا کے زیادہ آجانے سے پریشان ہوتے ہیں۔ جب کہ نہ ہونے سے خوش ومطمئن ہوتے ہیں۔ اس اعتبار سے وہ صابر وشاکر وقانع ہوتے ہیں۔ اگرچہ دنیاوی ضرورتیں اٹل حقیقت ہیں، ان سے فرار ممکن نہیں۔ زندگی کے لئے کھانا ضروری ہے، اس کے بغیر چارہ نہیں۔ لباس کے بغیر رہا نہیں جا سکتا۔ مکان بھی فرد کی ناگزیر ضرورت ہے۔ ان ضروریات کے لئے اہل اللہ کسی حد تک مادی ذرائع کا استعمال ضرور کرتے ہیں، لیکن ایک تو ان کی توجہ ونگاہ مادی ذرائع پر نہیں ہوتی۔ چونکہ مادی ذرائع اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے، اس لئے وہ اسے اختیار کرتے ہیں، لیکن ان ضروریات کے حوالے سے بھی ان کی اصل توقع وتوکل اس ذات پر ہی ہوتی ہے، اس لئے کہ اسباب میں جان وروح وہی پیدا کرتا ہے۔ اسباب کو کارآمد ونتائج خیز وہی بناتا ہے۔ اگر وہ اسباب کو بے اثر کردے تو سارے اسباب کے باوجود فرد بے بس بن کر رہ جاتا ہے۔

حقیقی محبّ چونکہ اپنے آپ کو مکمل طور پر اس کے سپرد کردیتا ہے۔ اس کی عبادت، اس کا ذکر وفکر، بندوں تک اس کی دعوت کی پیغام رسانی، اس کی مخلوق کی خدمت، اشاعت دین کا کام وغیرہ، یہ ساری چیزیں اس کی سرگرمیوں کا مرکز ہوتی ہیں، اس کا بیشتر وقت انہی چیزوں میں صرف ہوجاتا ہے، اس لئے دنیا کے لئے اس کے پاس نہ تو وقت ہوتا ہے اور نہ ہی اسے اس کی زیادہ فکر ہوتی ہے۔ اس طرح کے محبّ (محبت کرنے والے) کی کل ضروریات ہی کیا ہوتی ہیں۔ ایک دو جوڑے کپڑے، دوڈھائی اوقات کے لئے دو دوروٹیاں، یہ روٹیاں دودھ ولسی کے ساتھ ہوں یا سبزی کے ساتھ۔ یہی اس کی کل ضروریات ہوتی ہیں۔ محبوب، اس کی ان ضروریات کی تکمیل کا انتظام کرہی دیتا ہے۔ اور اس سلسلہ میں اسے دوسروں کا ہرگز محتاج نہیں بناتا۔ دعوت کے کام کے لئے جن ظاہری اسباب کی ضرورت ہوتی ہے، اس کے لئے اس کی صورت بھی پیدا کردی جاتی ہے اور اس کے لئے اس طرح انتظامات کردیئے جاتے ہیں کہ اس کو وہم وگمان بھی نہیں ہوتا کہ وسائل اس طرح بھی حاصل ہوتے ہیں۔

البتہ اس کے صبر کی آزمائش کے لئے محبّ کو وقتاً فوقتاً بظاہر سخت تنگی کے حالات میں مبتلا کردیا جاتا ہے۔ اس کا مقصود محبّ کو مستحکم کرنا ہوتا ہے اور ہر طرف سے بے نیاز کرکے، اسی سے مانگنے کی نفسیات کے ملکہ کو راسخ کرنا ہوتا ہے۔

محبّ نہ تو دنیا سے محبت کرتا ہے اور نہ ہی وہ دنیا داروں کی طرح مالی وسائل کے حصول کی جدوجہد میں توانائیاں صرف کرتا ہے، اس لئے کہ محبّ کی دنیا ہی دوسری ہوتی ہے، اس کی محبت کا مرکز صرف اور صرف محبوب ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ دوسری چیزوں سے اسے التفاف نہیں ہوتا۔ محبوب کا ذکر وفکر، محبوبِ حقیقی سے محبت واطاعت کی دعوت دینے کی فکر، محبت کے لئے آنے والے افراد کی تربیت کا کام، محبوب سے محبت کے پیغام کو عام کرنے کا اضطراب، آخرت میں محبوب سے ملاقات کی تیاری وغیرہ یہ سارے کام ایسے ہوتے ہیں، جو محبّ کی ساری ذہنی وعملی توانائیوں کا احاطہ کرلیتی ہیں اور اس کی توانائیوں کو نچوڑ لیتی ہیں۔

محبّ کی محبوب کے لئے فکرمندی قابل دید ہوتی ہے کہ وہ اس کے لئے تڑپتا رہتا ہے، اس کے بغیر وہ رہ نہیں سکتا، اس کے جو لمحات اس کے استحضار ودھیاں کے بغیر گزرتے ہیں، وہ اس کے لئے المناک ہی نہیں، بلکہ قیامت خیز ثابت ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ اس کا دل محبوب کے انوار حسن کا مشاہدہ کرکرکے، ان انوار پر فریفتہ ہوچکا ہوتا ہے۔ ادھر مادہ کی بے رحم طاقتیں اور نفس کی خونخوار قوتیں اور اس کے بشری تقاضے بعض اوقات اس کام میں حائل ہوتی ہیں اور خود دعوتی کام اس کی توجہ کو متاثر کرنے کا موجب

بنتا ہے۔ اس طرح کے حالات میں محبوب کے لئے محبّ کی بے تابی قابل رحم ہوتی ہے۔

فرد چونکہ مادی دنیا میں رہتا ہے، جہاں مادی تقاضوں، مادی نوعیت کے اثرات اور افراد سے رابطوں سے فرار ممکن نہیں، اس لئے محبّ کے لئے یہ پوری زندگی ایک طرح کی آزمائش بن جاتی ہے، بلکہ سخت کشمکش سے عبارت ہوجاتی ہے کہ روح کی لطافت محبوب کے، انوار حسن سے متمتع ہونے کے لئے ھل من مزید کی طالب ہوتی ہے، جب کہ مادی نوعیت کے تقاضے، جسمانی توانائی کی کمی، اس سلسلہ میں اس کا ساتھ دینے سے قاصر ہوتی ہے۔ اس طرح کے حالات میں محبّ کے لئے محبوب کے سامنے اپنی حالت زار کی فریاد کرنے اور اپنی بے بسی کا رونا روئے بغیر کوئی چارہ کار نہیں ہوتا۔

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا کہ محبّ کا دل درہم ودنیا کی محبت وچاہت سے خالی ہوتا ہے۔ اس لئے کہ محبوب حقیقی اور دولت کی محبت وچاہت بیک وقت ایک دل میں نہیں سما سکتی، یہ دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ جہاں دولت کی محبت ہوگی اور دولت کے مظاہر ہوں گے، وہاں محبوب مرکز بن سکے، ممکن نہیں۔ توحید کا تقاضا جو محبّ سمجھتا ہے، وہ یہ ہے کہ دل سے ہر طرح کے طاغوت یا غیر اللہ کی محبت کو نکال دیا جائے، دنیا وکثرت دولت جو طاغوت کی سب سے بُری صورت ہے، وہ دراصل بجائے خود معبود ہے، جو دنیا کو معبود بنالیتا ہے، وہ خدا کی خداوندی سے نکل جاتا ہے۔ بظاہر چاہے وہ اللہ کی عبدیت کی کتنی ہی دعویٰ کرے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے درہم ودینار کے عبد (بندہ) کو بددعا دی ہے کہ وہ گرے اور نہ اٹھے، دولت کے پرستار، دولت کے مجنوں اور دولت کو زندگی کا اوڑھنا بچھونا بنانے والے کو درہم کا عبد کہنا، یہ بتاتا ہے کہ اس طرح کا فرد اللہ کی عبدیت سے نکل جاتا ہے۔ وہ دولت کے معبود خانے کا سجدہ ریز ہوتا ہے اور اس کی آداب بندگی بجالاتا ہے، اس طرح کا فرد اللہ کی بندگی کے آداب کے سلیقہ سے آشنا ہونا تو دور کی بات ہے، وہ اللہ کے عبد (بند) کے ابتدائی تقاضوں سے بھی آشنا نہیں ہوتا، اس کے لئے اللہ محبوب کی عبدیت کے دروازے بند کردیئے جاتے ہیں۔ کتنی بڑی سزا ہے جو دنیا کے جنوں میں مبتلا فرد کو دی جاتی ہے۔

اللہ کے رسول ﷺ نے دنیا کی زندگی کو مسافر کے سفر سے تشبیہ دی ہے، جو راستہ میں درخت کے سایہ میں آرام کرکے چلا جاتا ہے۔

اس تشبیہ پر جتنا بھی غور کیا جائے، وہ سو فیصد صحیح نظر آئے گی کہ پچاس سو سال کی زندگی کا سفر اس تیز رفتاری سے گزر جاتا ہے کہ کل چند لمحوں کی زندگی نظر آتی ہے۔ انسانوں کا قافلہ ہزاروں سالوں سے آرہا ہے، اپنا سفر پورا کرکے تیز رفتاری سے رخصت ہوتا رہا ہے۔ ہماری نسل کے افراد کا سفر زندگی بھی اختتام پذیر ہے۔ زندگی کے ان ایام میں ہم نے کیا کھایا کیا پیا، لذت کی کیا چیزیں استعمال کیں، ان میں سے کوئی چیز یاد نہیں اور کسی چیز کی حلاوت کے اثرات محسوس نہیں ہوتے، یا حلاوت شدہ چیزوں کے اثرات مزاج پر چسپاں نہیں، اس طرح کی بے بقا زندگی کو مقصود بنانا اور اس زندگی کو دائمی زندگی پر قربان کرنا، خسارہ کا سب سے بڑا سودہ ہے۔

حقیقی مسافر تو وہ ہے، جسے اپنی اصل منزل کی فکرمندی دامنگیر ہے، وہ اس منزل تک بہتر طور پر رسائی کے لئے مضطرب ہو اور راستہ کی دشواریوں کا مقابلہ کرتے ہوئے بھی وہ منزل کی طرف رواں دواں ہو، جو جنگل کے درخت کے سایہ کو منزل سمجھکر اس پر ڈیرہ ڈال دیتا ہے، وہ بالآخر درندوں کا لقمہ بن جاتا ہے۔

دنیا کو مقصود بنانے کی ذہنیت ومزاج نے ہمیں مادیت کی بے رحم طاقتوں کے حوالے کرکے، ہمیں موت کے سے حالات سے دوچار کردیا ہے کہ لوگ اس زندگی کے سکھ وسامانِ راحت پر موت کو ترجیح دینے لگے ہیں۔ یورپ کے خوشحالی ملکوں میں خودکشی کا ریشہ سب سے زیادہ ہے۔ ہمارے ہاں بھی نفسیاتی بیماریوں کا سب سے زیادہ شکار مالدار ہی ہیں۔

ایسی دولت پر لعنت ہو، جو فرد کو انسانیت سے دور کرکے، اس کی اخلاقی وروحانی صلاحیتوں کو مفلوج کردے۔ اور اسے موت سے پہلے موت کے سے اذیتناک حالات سے دوچار کردے۔

دنیا پر ٹوٹ پڑنے کی نفسیات دراصل احساس کی خرابی کا نتیجہ ہے، ورنہ کثرت دنیا بجائے فرد کی ناگزیر ضروریات کا حصہ نہیں ہیں، وہ احساس کی خرابی کی وجہ سے صرف اور صرف دل بہلانے کی چیز ہے یا ملعون نفس کو طاقتور بنانے اور انسانیت کو پامال کرنے کا ذریعہ ہے۔

دنیا پرستی کی نفسیات یا احساس کی یہ خرابی دراصل روح کی ضروریات اور اس کی تسکین وتکمیل سے بے اعتنائی کی سزا ہے۔ جو مادہ پر فریفتگی اور انسانیت کی پامالی کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔

پاکستانی ملت کی حالت زار

اور ذکر کے اہتمام سے اس کے تدارک کی صورت

آج مسلم امت کی جو حالت زار ہے، اس پر ہرحساس فرد خون کے آنسو بہائے بغیر نہیں رہ سکتا، مسلم امت کی زندگی کا کوئی شعبہ اور کوئی محاذ ایسا نہیں رہا، جس پر وہ عالمی کفر کے ہاتھوں شکست وریخت سے دوچار نہ ہو۔ تہذیبی محاذ ہو یا ذہنی آزادی کا محاذ، معاشی خود کفالت کا محاذ ہو یا تعلیمی وتربیتی اور عسکری وسیاسی آزادی کا محاذ ، ہر اعتبار سے وہ مادہ پرست عالمی طاقتوں کی محتاج ودست نگر ہے۔ ان محاذوں میں سب سے خوفناک محاذ ذہنی غلامی اور تہذیبی یلغار کا محاذ ہے، جس نے عالم اسلام کو کفر کی طاقتوں کا لقمہ تر بنا دیا ہے۔

ان محاذوں پر شکست کا نتیجہ ہے کہ ہماری سیاسی آزادی ختم ہے، ہماری سیاست کا سارا نقشہ عالمی قوتوں اور عالمی شاہوکار کی طرف سے بن کر آتا ہے اور ہمارے حکمراں اس پر عمل پیرا ہونے کے پابند ہوتے ہیں، ہماری معیشت آزاد نہیں، ساری معاشی پالیسیاں، عالمی مالیاتی اداروں کی طرف سے تیار ہوکر آتی ہیں اور نافذ ہوتی ہیں۔

ہمارا تعلیمی وتربیتی نظام آزاد نہیں، عالمی کفر ہمارے تعلیمی وتربیتی نظام پر پوری نگاہ رکھتا ہے کہ اس کے ذریعہ سے باغیرت اور مسلمان ذہن کے افراد تیار ہونے کی بجائے نفس پرست اور تہذیب جدید پر فریفتہ افراد تیار ہوکر سامنے آئیں، اس سلسلہ میں ہمارے پرائمری سطح کے نصاب سے لے کر ایم اے کے نصاب کی سطح تک ایک ایک چیز کی نگرانی کی جاتی ہے۔ ہماری میڈیا کو مختلف طریقوں سے خریدا گیا ہے، چنانچہ اس کی طرف سے مسلم معاشرہ کو دیوس بنانے اور مادر پدر آزاد فضا پیدا کرنے کی کاوشیں عروج پر ہوں۔

پاکستان کی مسلم ملت عرصہ سے امن وامان کی نعمت سے محروم ہے۔ اس لئے کہ عالمی شاہوکار نے ہمارے ہی افراد کو خرید کر، انہیں مختلف نعرے دے کر، ان کی ذہن سازی کرکے، انہیں قتل وغارت گری کی راہ پر گامزن کیا ہوا ہے۔ حکمراں چونکہ عالمی شاہوکار کے مراعات یافتہ ہیں، اس لئے وہ قتل وغارت گری کو روکنے کی سنجیدہ کوششوں کے لئے تیار نہیں، کراچی شہر ایک عرصہ سے بے گناہ افراد کا قتل گاہ بن گیا ہے۔

مغربی نظام تعلیم کی تباہ کاریاں اس حد تک پہنچ چکی ہیں کہ ہمارے ملک کا لگ بھگ ہر ذہین اور جدید تعلیم یافتہ فرد، فروخت ہونے کے لئے تیار ہے، ہزارہا سے زیادہ افراد ہیں، جنہیں این جی اوز کے ذریعہ خرید کر، سیکولرزم کی فضا پیدا کرنے کے مقصد کے لئے استعمال کیا جارہا ہے۔

یہ صورتحال ایسی ہے، جسے کسی سیاسی یا کسی ہنگامی انقلابی طریقہ سے تبدیل کرنا ممکن نہیں۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ مادہ پرست اور نفس پرست قوتوں کے خلاف افراد کے اندر مزاحمانہ قوت پیدا کرنے اور ان کے ضمیر کو بیدار کرکے، ان کی باطنی حسوں کو طاقتور بنایا جائے، تاکہ وہ ذاتی مفادات کی خاطر ملت فروشی کے کردار سے اندرونی ایمانی قوت اور ایمانی نور کے زور سے انکار کرسکیں اور ملت اسلامی کے تحفظ کے لئے دینی حمیت کے جذبات کے تحت کردار ادا کرسکیں۔

إِنَّ اللّٰهَ لاَ يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّى يُغَيِّرُواْ مَا بِأَنْفُسِهِم. (بے شک اللہ تعالیٰ کسی قوم کی حالت میں تغیر برپا نہیں کرتا جب تک وہ خود اپنے اندر میں تغیر برپا نہیں کرتی۔)

انسانی نفس کی نوعیت کو سمجھنے والے مسلم ماہرین نفسیات (جنہیں اصطلاح میں اہل اللہ اور علمائے ربانیین کہا جاتا ہے) ان کا کہنا ہے کہ انسانی نفس کی قوت بے انتہا خوفناک ہے۔ یہ قوت سارے درندوں کی قوت سے بڑھکر خطرناک ہے۔ یہ قوت ایٹم بم سے زیادہ خوفناک ہے۔ نفس کی اس قوت کو اللہ ورسول کے تابع بنانے، اسے مہذب بنانے اور اس قوت کو اسلام اور ملت کے مفادات کے لئے استعمال کرنے اور نفسی قوت کی طرف سے خارجی دشمن کی ساری مالی مراعات سے انکار کرنے کی نفسیات پختہ کرنے کی صورت ایک ہی ہے کہ مسلم معاشرہ میں رجوع الی اللہ کی تحریک شروع ہو، رجوع الی اللہ کی یہ تحریک اللہ

کے ذکر کے حلقوں کو مستحکم کرنے سے ہی مستحکم ہوسکتی ہے۔ **وَلَذِكْرُ اللّٰهِ أَكْبَرُ**، اللہ کے ذکر کو معمولی چیز نہ سمجھیں، یہ بہت بڑی چیز ہے، بہت بڑی طاقت ہے۔

اللہ کے ذکر کی کمی سے روح ودل بیمار ہوجاتے ہیں، جس سے نفسانی خواہشات طاقتور ہوجاتی ہیں، اس سے افراد کی نفسیات میں فساد برپا ہوجاتا ہے اور معاشرہ میں وہ ساری بیماریاں پیدا ہوجاتی ہیں، جس کا ہم رونا روتے ہیں اور جس کا اس وقت ہمیں سابقہ درپیش ہیں۔

حب جاہ وحب مال کی دوڑ، دشمن سے پیسے لے کر اپنی ملت کو پامال کرنے کی سرگرمیاں، کرسی کے حصول کے لئے ایک دوسرے سے دست وگریباں ہونا، گروہی، جماعتی تعصّبات، فرقیواریت اور قومیتی جذبات کا بڑھنا اور اس کی وجہ سے قتل وغارت گری کی روش پر گامزن ہونا، حکمرانوں وافسروں کی طرف سے لوٹ مار کا سلسلہ شروع ہونا، مذہبی طبقات کی طرف سے حسدوجلن کی خاطر ایک دوسرے کو گرانے کی کاوشوں کا ہونا، ڈپریشن کی بڑھتی ہوئی بیماریاں، سیاست سے لے کر گھروں تک کو میدان جنگ بنانے کی صورت کا ہونا، دولت ودنیا کو مقصد بنا کر اللہ کی دی ہوئی ساری توانائیاں دولت کے لئے صرف کرنے کے جنون کا ہونا، زیادہ سے زیادہ املاک بنانے، بڑی بڑی گاڑیوں اور بنگلوں کے نہ ختم ہونے والے خواب وغیرہ یہ ساری بیماریوں باطن میں موجود ایک زبردست خلا کا نتیجہ ہیں، یہ خلا دراصل دل وروح کی کثرت ذکر کے ذریعہ محبوب حقیقی کے انوار حسن سے عدم بہرہ وری کا خلا ہے۔ اس خلا کو ذکر وفکر اور اللہ ورسول کی مخلصانہ اطاعت کے ذریعہ ہی پورا کیا جا سکتا ہے اسے پُر کرنے کا دوسرا کوئی طریقہ نہیں۔

جب تک معاشرہ میں ذکر وفکر اور مخلصانہ اطاعت اور رجوع الی اللہ کے ذریعہ زندگی کے رخ کو بدلنے کی تحریک شروع نہ ہوگی اور ذکر وفکر کے حلقے مستحکم نہ ہوں گے۔ ہماری قومی زندگی میں بڑھتے ہوئے زوال وفساد سے بچاؤ کی ساری صورتیں مسدود رہیں گی۔

اللہ کے ذکر میں وہ توانائی اور نور موجود ہے کہ وہ فرد وافراد کو مادی دنیا، مادی جذبات اور نفسی قوتوں سے اوپر اٹھا کر، جوہر انسانیت سے بہرہ ور کرنے کا ذریعہ بنتا ہے۔ اللہ کا کثرت ذکر اور اس کی مخلصانہ اطاعت اپنے ساتھ اللہ کی مدد ونصرت، اور معیت لانے کا موجب بنتا ہے، اللہ کا کثرت ذکر افراد کو جوڑنے، امت کے تصور کو پختہ کرنے اور افراد کے درمیاں موجود دشمنیوں اور اختلافات کو ختم کرنے اور وحدت امت پیدا کرنے کی خاصیت رکھتا ہے، کثرت ذکر، دنیا کے حوالے سے افراد کے سارے خیالات، احساسات وجذبات کو پاکیزہ بنا کر، ان کی ساری حسرتوں اور ارمانوں کی تکمیل کا ذریعہ بنتا ہے۔

کثرت ذکر کا نور فرد کے مزاجی سانچہ کی اس طرح تشکیل کرتا ہے، جس سے دل میں اللہ کی محبت کے علاوہ دوسری محبتوں کے لئے گنجائش موجود نہیں ہوتی، اگر ہوتی بھی ہے تو وہ اللہ کی محبت کے تابع اور اس کے احکامات کے مطابق ہوتی ہے، کثرت ذکر کی ایک خاصیت یہ ہے کہ ایسا فرد وافراد اللہ کے ہوجاتے ہیں اور اللہ ان کا ہوجاتا ہے، حدیث کے مطابق **من كان الله فهو لله**. ملت کے جس گروہ کے ساتھ اللہ کی طاقت شامل ہوجائے، وہ فساد سے دوچار ہو، اس میں قتل وغارت گری کا سلسلہ شروع ہو، دشمن اسے سازشوں کے ذریعہ پامال کرے، یہ ممکن ہی نہیں۔

کثرت ذکر کا نور اپنے ساتھ حکمت، فراست وبصیرت بھی لاتا ہے۔ **اتقوا فراسة المؤمن فانه ينظر بنور الله**. مومن کی فراست سے ڈرو، اس لئے کہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔

رسالمآب ﷺ نے ذکر کے حلقوں کو جنت کے باغوں سے تعبیر کیا ہے، فرمایا ہے کہ جنت کے باغوں سے گذرا کرو تو جنت کے میوے کھایا کرو، صحابہ کرام نے دریافت کیا کہ یارسول اللہ ﷺ، جنت کے باغ کیا ہیں، آپ نے فرمایا۔ ذکر کے حلقے۔ اللہ کے رسول نے ذکر ہی کو زندگی قرار دیا ہے اور ذکر سے محرومی کو موت سے تشبیہ دی ہے۔

ذکر تقویٰ پیدا کرتا ہے، جو سارے گناہوں سے بچاؤ کی صورت ہے۔ جس تقویٰ

کے نتیجہ میں دین ودنیا اور آخرت کی جملہ سعادتوں کی خوشخبری ہے۔

یاد رکھیں، یہ دنیا، اللہ کے ذکر سے ہی قائم ہے۔ جب اللہ کے ذکر کی فضا ختم ہوجائے گی، دنیا کا بوریا بستر لپیٹ دیا جائے گا۔ حدیث شریف ہے کہ دنیا اس وقت تک قائم ہے، جب تک اس میں ایک بھی اللہ اللہ کرنے والا فرد موجود ہے۔

ذکر اپنے ساتھ اللہ ورسول کی مخلصانہ اطاعت، حمیت دین، اشاعت دین، غلبہ دین اور کفر اور کفر کی قوتوں کے خلاف جہاد کے جذبات بھی ساتھ لاتا ہے۔ یہ ساری چیزیں ذکر کی خصوصیات میں شامل ہیں۔

جب اللہ کی مخلصانہ اطاعت والی زندگی حاصل ہوجاتی ہے تو اللہ کی طرف سے درج ذیل بشارتیں ملتی ہے۔

وَلَوْ أَنَّ أَهْلَ الْقُرَى آمَنُواْ وَاتَّقَواْ لَفَتَحْنَا عَلَيْهِم بَرَكَاتٍ مِّنَ السَّمَاءِ وَالأَرْضِ. (اور اگر یہ دیہات والے ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ہم ان کے لئے زمین وآسمان کی رحمتوں کے دروازے کھول دیتے)۔

يُثَبِّتُ اللّهُ الَّذِينَ آمَنُواْ بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الآخِرَةِ. (اللہ تعالیٰ ثابت قدم رکھے گا مومنوں قول ثابت یعنی (کلمہ لاالہ) کی برکت سے دنیا کی زندگی میں بھی تو آخرت کی زندگی میں بھی)۔

لِّلَّذِينَ أَحْسَنُواْ فِي هَذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ وَلَدَارُ الآخِرَةِ خَيْرٌ (نیکوکاروں کے لئے اس دنیا میں بھی بہتری ہے تو آخرت میں تو مزید بہتری ہے)۔

تنقیدی نفسیات

اورمعاشرے پر اس کے اثرات ونتائج

زیرنظر مضمون راہ سلوک میں چلنے والے ان ذہین افراد کے لئے لکھا گیا تھا، جو دینی، مذہبی وروحانی قیادت کے قول وعمل کے تضادات اور مطلوبہ معیار سے فروتر کردار کی وجہ سے تنقیدی رجحان کے حامل بن رہے ہیں۔لیکن بعد میں مضمون میں اضافہ کرکے، اس میں معاشرہ میں بڑھتی ہوئی تنقیدی نفسیات کا جائزہ بھی شامل کر لیا گیا ہے۔ یہ مقالہ ہفتہ وار تربیتی نشست کے لئے لکھا گیا تھا اور اس میں پڑھا گیا۔ **(ادارہ)**

ا۔ اپنی اصلاح کی فکر کرنا اہم تر ہے

موجودہ دور میں دوسروں کی بہت زیادہ فکرمندی نقصان دہ ہے۔ اپنی کھال بچانے کی فکر ہونی چاہئے، اگر اپنے ایمان کا بچاؤ ہوگیا، اپنے اعمال کی اصلاح ہوگئی، اپنی نیت کے فساد سے بچاؤ کی صورت پیدا ہوگئی تو گویا سب کچھ حاصل ہوگیا، بلکہ سعادت دارین حاصل ہوگئی۔ اس وقت عالمی سطح پر جو فساد برپا ہے، ہر سطح کے افراد کے اخلاق ومعاملات میں جو خرابیاں پیدا ہوگئی ہیں، مذہبی طبقوں اور روایتی روحانی حلقوں میں نام وری، شہرت اور دولت کے حصول کی جو دوڑ شروع ہے، یہ ساری چیزیں ایسی ہیں، جن کی اصلاح فرد کی بساط سے باہر ہے، فرد جس چیز کا ذمہ دار ہے، وہ اپنے آپ کو ہر طرح کے فساد سے بچانا ہے اور اپنی صلاحیت کے تحت دعوتی کام کرنا ہے، دوسروں کی اصلاح کے درپے ہرگز نہیں پڑنا ہے، اس لئے کہ اس سے فرد کا فساد میں مبتلا ہونے کا خطرہ لاحق ہے۔

دوسروں پر تنقید سے ہر ممکن حد تک بچنا چاہئے، اس لئے کہ نفس دوسروں پر اصلاح کی نیت سے تنقید کی آڑ میں فرد کو اپنے زہد اور اپنی بزرگی کے مرض میں مبتلا کرنا چاہتا ہے۔ اپنے زاہد اور بزرگ ہونے کے جذبہ وداعیہ کو دوسروں کی خرابیوں کی تنقید سے بڑی

تقویت ملتی ہے۔اس نکتہ کو سمجھکر اپنے نفس کو سمجھانا اور اسے قابو میں رکھنا ضروری ہے۔ زوال کے دور میں خود احتسابی کی زیادہ ضرورت ہے۔ دوسری صورت میں نفس کی شہ زوری اور بزرگی کا زعم فرد کو اپنی اصلاح سے غافل کرکے، دوسروں کی فکر میں غلطاں کرے گا۔ اس طرح فرد اصلاح کے نام پر محرومی سے دوچار ہوگا۔

۲۔نفس کی اکساہٹوں سے بچنا

فرد کے نفس کی تشکیل کچھ اس طرح ہوئی ہے کہ وہ جس شعبہ زندگی سے بھی وابستہ ہے، اس شعبہ میں دوسری باصلاحیت شخصیتوں کو آگے بڑھتے ہوئے دیکھنا نہیں چاہتا۔ اس سلسلہ میں وہ نہ چاہتے ہوئے بھی حسد وجلن کا شکار ہوجاتا ہے۔ مذہبی وروحانی حلقوں کے باصلاحیت افراد کے نفس کی بھی عام طور پر حالت یہی رہتی ہے۔نفس اپنی بڑائی کے مقابلہ میں دوسروں کی بڑائی اور معاشرہ میں ان کی ہر دلعزیزی ومقبولیت دیکھنے کا ہرگز روادار نہیں۔

نفس کی چاہت ہوتی ہے کہ شہرت ہو تو اسی کی ہو، لوگوں کی عقیدت کا مرکز ہو تو وہی ہو۔ مان ومرتبہ اور عزت حاصل ہو تو اسی کو ہو۔لیکن چونکہ نفس پرستی کے ان میلانات کے علی الاعلان اظہار سے اس کی نیکوکاری کی ساری عمارت زمین بوس ہوجاتی ہے، اس لئے فرد اپنی معاصر مذہبی وروحانی شخصیتوں پر تنقید کے لئے ان شخصیتوں کی کمزوریوں ونقائص کا سہارا لے کر، ان کے خلاف فضا ہموار کرنے اور معاشرہ میں انہیں متنازع بنانے کے لئے کوشاں ہوتا ہے، مقصد یہ ہوتا ہے کہ دوسروں کی توقیر وشرف کی قیمت پر اسے معاشرہ میں عزت حاصل ہو اور وہ لوگوں کی توجہ کا مرکز بنے یا وہ توجہ کا مرکز نہ بھی بنے تو معاصر شخصیتوں کی حیثیت تو ضرور مجروح ہو۔

نفس کے مکر وفریب کی یہ واردات بہت زیادہ پوشیدہ اوردر پردہ ہوتی ہیں، انہیں سمجھنے کے لئے قلب سلیم چاہئے اور روش ضمیری، جو ذکر وفکر کے غیر معمولی مجاہدوں،اہل اللہ کی صحبت اور مسلسل خود احتسابی کے ذریعہ ہی حاصل ہوسکتی ہے، اس کے بغیر ہر شعبہ سے وابستہ افراد،نفس کے ان میلانات کا شکار ہوئے بغیر رہ سکیں،مشکل ہے۔

جہاں تک معاشرہ میں موجود خرابیوں اور بگاڑ کا تعلق ہے، ان خرابیوں کی نشاندہی کرنا اور ان کے خلاف آواز بلند کرنا یہ مصلحین کا کام ہے، جو نفس مطمئنہ کے حامل ہوتے ہیں۔جنہیں اللہ تعالیٰ اپنے فضل خاص سے نفسی جذبات اور جلن جیسے میلانات سے بلند کر دیتا ہے، جو پاکیزہ جذبات کے حامل ہوتے ہیں، جو اپنی اصلاح سے کسی بھی وقت غافل نہیں ہوتے اور جو دوسروں کی اصلاح اور ان پر موثر پیرایے میں تنقید کے سلیقہ سے آشنا ہوتے ہیں۔

اس نکتہ کو نہ سمجھنے کی وجہ سے ہم جیسے افراد اگر تنقیدی حس کو دبانے کی بجائے اسے بیدار کریں گے تو اس سے فساد ہی جنم لے گا۔

یہ فساد فرد کے اپنے نفس کی اصلاح کی راہ میں بھی شدید حامل ہوگا تو اس سے افرادِ معاشرہ کے درمیاں ٹوٹ پھوٹ بھی پیدا ہوگی نیز فرد مذہبی وروحانی شخصیتوں یعنی علمائے ربانی کی فیض رسانی سے محرومی کے خطرہ سے دوچار ہوگا۔

۳۔تنقید سے انتشار وافتراق کا پیدا ہونا

باصلاحیت مذہبی افراد پر بعض اوقات یہ میلان بہت غالب ہونے لگتا ہے کہ وہ ہر صورت میں افرادِ معاشرہ کی اصلاح کا ذمہ دار ہے اور اس سلسلہ میں دوسروں کے فکر ونظر واعمال پر تنقید اس کا ایسا فریضہ ہے، جس کی عدم ادائیگی سے وہ گنہگار ہوگا۔

لیکن عام طور پر اس سے اس فریضہ کی ادائیگی اس طرح ہوتی ہے، جس سے ایک تو اس کے مزاج کی سختی میں اضافہ ہوتا ہے اور اس کا ضمیر مضطرب ہوجاتا ہے، دوم یہ کہ اس سے معاشرہ میں گروہ بندی کو تقویت ملتی ہے۔ نیز مختلف مکتبہ فکر سے وابستہ افراد کے درمیاں تلخیوں میں اضافہ ہوتا ہے، جس سے باہمی قربت کی صورت ناپید ہوجاتی ہے۔

ضرورت تو اس بات کی ہے اور دین کا بنیادی مطالبہ بھی یہ ہے کہ افرادِ معاشرہ کے دلوں کو جوڑا جائے اور امت کے رشتہ کو مستحکم تر کیا جائے۔ جب کہ مذکورہ روش سے یہی کام ہے، جو بکھرتا ہے اور امت پن کا رشتہ کمزور سے کمزور تر ہوتا ہے۔

جب تک فرد کی اصلاح اس مقام پر نہیں ہوتی، جہاں بے جا تنقید وصحیح تنقید، نفسی آمیزشوں پر مشتمل تنقید اور اخلاص سے سرشار تنقید ان دونوں کے درمیاں اس کے دل پر امتیازی خطوط پوری طرح واضح اور منکشف نہ ہوں، تب تک تنقیدی روش اور تنقیدی مزاج

کا حامل ہونا فرد کے لئے خطرہ سے خالی نہیں ہے۔ اس طرح کا تنقیدی مزاج فرد کی اصلاح کی راہ میں شدید حائل ہوگا۔

۴۔ غلط تنقید کے نقصانات

معاشرہ میں رواداری کو فروغ دینے اور باصلاحیت افراد کی اپنی اصلاح کی بہتر صورت یہی ہے کہ وہ دینی، مذہبی وروحانی حلقوں کی خامیوں سے زیادہ ان کی خوبیوں اور مثبت کردار کے پہلوؤں کو پیش نظر رکھیں، کیونکہ ایک تو اللہ کے ہاں ان کی خامیوں وکوتاہیوں کی گرفت ان سے نہیں ہوگی، دوم اس لئے کہ اس طرح کی تنقید سے استفادہ کی بجائے دوری کی دیوار میں اضافہ ہی ہوگا۔

ویسے بھی یہ حقیقت ہے کہ ایسی تنقید جس میں نفسانیت کی آمیزش شامل ہوتی ہے اور جس میں تشدد کے اجزاء موجود ہوتے ہیں، وہ دعوتِ غوروفکر واصلاح کا ذریعہ نہیں بنتی۔

۵۔ تنقیدی نفسیات کے مضر اثرات

اس ضمن میں ایک اہم نکتہ جسے پیش نظر رکھنا ضروری ہے، وہ یہ ہے کہ دینی، مذہبی وروحانی حلقوں کا معاشرہ میں تعارف اور ان کی حیثیت دین ومذہب کے حوالے سے ہے۔ موجودہ دور جو مذہب ولامذہبیت کا دور ہے، جہاں مذہب سے آزاد اور فری سوسائٹی کی کوششیں دجالی تہذیب کے علمبرداروں کی سرپرستی میں جاری ہیں، اس دور میں مذہب سے وابستہ حلقے اپنی ساری کمزوریوں کے باوجود ایک طرح سے لادینیت کے خلاف حصار کی حیثیت رکھتے ہیں علمائے ربانی جواب بھی خاموشی اور بغیر کسی پبلسٹی کے لوگوں کی اصلاح وتزکیہ کے کام میں مصروف ہیں، وہ ہرجگہ اپنی اپنی صلاحیتوں کے تحت کام کررہے ہیں۔ البتہ یہ بجا ہے کہ لا مذہبیت کی اس عالمگیر تحریک کی بہتر طور پر روک تھام کی صورت پیدا نہ ہونے میں دینی ومذہبی وروحانی حلقوں سے وابستہ افراد کی حکمت عملی کے نقائص شامل ہیں، تاہم حکمت عملی کے ان نقائص کی بہتر طور پر نشاندہی مصلحین ہی کر سکتے ہیں، ہم جیسے افراد کا کام یہ ہے کہ اپنی اصلاح کی فکر کرتے رہیں اور معاشرہ میں مثبت طور پر دعوتی کام کرتے رہیں، اس کام میں اگر مذہبی وروحانی حلقوں کے پیدا کردہ دائراتی خول رکاوٹ ہیں تو ان دائراتی خولوں سے بلند ہوکر کام کرنے کے لئے کوشاں ہوں اور مسلکی وجماعتی اختلافات سے دامن بچا کر چلنے کی سعی کریں۔

تنقید کی ''خاصیت'' ہے کہ جب ایک بار تنقیدی حس بیدار ہوجاتی ہے تو اس سے رفتہ رفتہ تنقید، فرد کی نفسیات کا حصہ بن جاتی ہے اور اپنے شعبہ سے وابستہ معاصر شخصیتوں کا ذکر خیر ہوتے ہی فرد میں اپنے بڑے پن اور اپنی شخصیت کے انانیت کے جذبات کے زیر اثر حسد وجلن کے احساسات کروٹ لینے لگتے ہیں، بلکہ اندر میں آگ سی لگ جاتی ہے کہ میرے ہوتے ہوئے دوسروں کی تعریف ہورہی ہے، چونکہ اس طرح کے مواقع پر نفس کے چھپے ہوئے جذبات کے علی الاعلان اظہار سے فرد کے بارے میں لوگوں میں نفس پرستی کا تاثر ابھرنے لگتا ہے، اس لئے فرد خیر وبھلائی اور اصولوں کی آڑ میں ایسا کرتا ہے اور دوسروں کی خامیوں وکوتاہیوں وخرابیوں کو اجاگر کرنا شروع کردیتا ہے۔

دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ عام طور پر ہر ذہین، باصلاحیت ومتحرک فرد کی یہی روش ہوتی ہے۔ تنقید کا نشانہ زیادہ تر اپنے شعبہ سے وابستہ معاصر شخصیتیں ہی ہوتی ہیں۔ دانشور، اپنے ہی دانشوروں کو مشق ستم بناتا ہے۔ عالم، اپنے ہی ساتھی علماء کی کوتاہیوں کو طشت بام کرتا ہے، تصوف سے وابستہ فرد تصوف کے علمبرداروں کے حب جاہ وحب مال اور زیادہ سے زیادہ مرید بنانے کی فکرمندی کے واقعات بیان کرتا ہے۔ اہل سیاست حکمرانوں اور دوسرے سیاستدانوں کی تذلیل کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

غرض کہ تنقیدی حس بالآخر تنقیدی نفسیات میں تبدیل ہوجاتی ہے۔ چونکہ فرد وافراد کی اپنی اصلاح یا تو نہیں ہوتی یا برائے نام ہوتی ہے یا وہ راہ سلوک میں ابھی نفس کو مطیع کرنے کے ابتدائی ودرمیانی حالت میں ہوتا ہے، اس لئے نفس دوسروں پر تنقید کے شدید میلانات کے تحت ان پر حملہ آور ہونے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔

تنقیدی نفسیات کا ایک نتیجہ جو معاشرہ کو بھگتنا پڑتا ہے، وہ یہ ہے کہ سیاسی، مذہبی، روحانی اور ہر طرح کی شخصیتوں پر اعتماد مجروح ہوجاتا ہے۔ اور ہر طرح کی شخصیتوں سے نفرت وکدورت پیدا ہوجاتی ہے اور اس طرح معاشرہ مقامی سطح سے لے کر قومی سطح تک قیادت پر اعتماد کے بحران سے دوچار ہوجاتا ہے۔

تنقیدی نفسیات کا ایک نتیجہ یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ افراد، نفسیاتی بیماریوں کے شکار

ہوجاتے ہیں۔ اس لئے کہ انانیت کے مرض کی خاصیت ہی یہی ہے کہ اپنی شخصیت کے شرف کے علاوہ دوسروں کی تحقیر مزاج کا حصہ بن جاتی ہے ایسے افراد اکثر اپنی برتری کی نفسیات ہی میں جیتے ہیں۔

یہ دراصل نفس اور نفس کے یرغمال شدہ عقل ہی کی کارستانی ہوتی ہے۔ اور دل کے خالی ہونے یا دل کو محبوب حقیقی کے ذکر کی مطلوبہ غذا نہ ملنے اور اہل اللہ کے سامنے اپنے آپ کو پامال نہ کرنے کی سزا ہوتی ہے۔

۶۔ اخلاص کے باوجود تنقید کی ضرر رسانی

دیکھا گیا ہے کہ بعض شخصیتوں میں اخلاص کے باوجود تنقیدی مزاج غالب ہوجاتا ہے۔ اس کا اہم سبب غلط فہمیاں، صحیح معلومات کا فقدان، حسن ظن کی کمی، ایک دوسرے سے دوری، اپنے دائراتی خولوں میں بندش، سنی سنائی باتوں پر اعتماد اور دوسروں کے حالات کو صحیح پس منظر میں سمجھنے وجاننے کی طلب کا نہ ہونا ہوتا ہے۔ اگرچہ اخلاص کی بنا پر اس طرح کا تنقیدی مزاج قابل معافی ہو، لیکن اس سے معاشرہ میں ایک دوسرے سے دوری، نفرت وکدورت کی جو فضا پیدا ہوتی ہے اور معاشرہ جس طرح ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوتا ہے، اخلاص کے باوجود اس صورتحال سے بچاؤ کی صورت تو ممکن نہیں، اس لئے اخلاص کے ساتھ ساتھ افراد کے بارے میں صحیح معلومات کا ہونا بھی ضروری ہے، تاکہ اخلاص کی حامل شخصیتیں امت میں تقسیم اور معاشرہ کی ٹوٹ پھوٹ کا ذریعہ بننے سے بچ سکیں۔

۷۔ تنقید کے لیے اخلاص، للّٰہیت اور بے نفسی کی ضرورت

اخلاص، للّٰہیت وبے نفسی جب اعلیٰ درجہ پر پہنچ جاتی ہے تو وہ اپنے ساتھ حکمت، فراست، دوسروں کے ساتھ حسن ظن، اور علمی اختلافات کے باوجود ایک دوسرے سے قربت ومحبت کے جذبات بھی لاتی ہے اور علمی ومسلکی اختلافات کو محدود دائرہ میں رکھنے کا سلیقہ بھی ساتھ لاتی ہے۔ اس سلسلہ میں بزرگوں کے واقعات شاہد ہیں کہ وہ حکمت عملی یا علمی اختلاف کے باوجود ایک دوسرے سے قربت ویگانگ کی فضا کو متاثر ہونے نہیں دیتے تھے۔ اس لئے کہ وہ اپنی رائے کو قرآن وسنت کی طرح اٹل نہیں سمجھتے تھے، نیز للّٰہیت وبے نفسی فرد کی انا اور نفسی جذبات کو پامال کردیتی ہے۔ وہ اپنی شخصیت کو حقیقی معنیٰ میں مٹا دیتے ہیں اور دوسروں کی تکریم کے احساسات ان کے مزاج کا حصہ بن جاتے ہیں۔

۸۔ جدیدیت سے مرعوبیت

اس وقت دین ومذہب سے وابستہ ذہین وباصلاحیت افراد سہ طرفہ بحران سے دوچار ہیں۔ ایک یہ کہ وہ جب روایتی دینی، مذہبی وروحانی قیادت کو مذہب کے نام پر بڑی گاڑیوں اور شان شوکت کے ساتھ دیکھتے ہیں اور دنیا واہل دنیا سے بھرپور استفادہ کی حالت میں دیکھتے ہیں تو وہ ردعمل کا شکار ہوجاتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ جب وہ دینی قیادت میں بالعموم فکری جمود اور جدیدیت کے چیلنج سے ناآشنائی اور فروعی مسائل میں باہمی تنازعات واختلافات کی وجہ سے ایک دوسرے سے قطع تعلق کی حالت میں دیکھتے ہیں تو مذہبی قیادت سے ان کا اعتماد مجروح ہونے لگتا ہے۔ تیسرے یہ کہ روحانیت سے محرومی، حقیقی علمائے ربانی سے عدم تعلق، سلف صالحین کی فکر سے عدم استفادہ، یا ان پر عدم اعتماد کی وجہ سے وہ اندر سے خالی ہوتے ہیں، اس طرح وہ خوداعتمادی کے بحران سے دوچار ہوجاتے ہیں۔ ان حالات میں انہیں جب جاوید احمد غامدی صاحب جیسے متجدد دین کو سننے اور پڑھنے کا موقعہ ملتا ہے اور طبقہ علماء اور اہل تصوف کے خلاف ان کی علمی گفتگو سنتے ہیں تو وہ ان کی طرف لپک پڑتے ہیں، اور ان کی آواز کو اپنی دل کی آواز سمجھنے لگتے ہیں۔ اس وقت ہمارے ہاں ملک بھر کی بعض ممتاز دینی فضلاء کی اولاد جاوید احمد غامدی صاحب جیسے دانشور کو اپنا فکری قائد سمجھنے میں خوشی محسوس کرنے لگی ہے۔ ذہین وباصلاحیت افراد کی یہ ایسی المناک صورتحال ہے، جو انتہائی قابل رحم ہے۔

ذہین مذہبی افراد کو اس بحران سے نکالنے کی بظاہر کوئی صورت موجود نظر نہیں آتی۔

۹۔ تنقیدی مزاج اور اس کی خرابیاں

ان حالات میں دینی ومذہبی قیادت پر تنقید نہ کرنے اور اپنی اصلاح کی فکر کو غالب

کرنے کی ہماری آواز صدا بصحرا ہی ثابت ہوگی۔ لیکن میری یہ گفتگو ان احباب واصحاب سے ہے جو صحیح فکر کے حامل ہیں اور جو ردعمل کا شکار نہیں جو مذہبی وروحانی قیادت کی کمزوریوں کی وجہ سے ان سے شاکی ہیں اور اس کی وجہ سے ان کی تنقیدی حس میں اضافہ ہونے لگتا ہے۔

ہمارے ان دوستوں کو سمجھنا چاہئے کہ ہم جس دور میں رہ رہے ہیں، وہ ابتلا وآزمائش کا شدید دور ہے، اس دور میں ایمان پر قائم رہنا، اصلاح کی راہ پر گامزن ہونا، دوسروں کے منفی رویے کا تاثر لے کر ردعمل کا شکار نہ ہونا، ہر طرح کے حالات میں صبر وشکر سے کام لینا، دوسروں سے حسن ظن کا معاملہ کرنا، تاویلات کے ذریعہ ان کی غلطیوں کو ان کے محاسن شمار کرنا، یہ ایسی چیزیں ہیں، جو راہ سلوک اور راہ محبت کا ناگزیر حصہ ہیں۔ بالخصوص مبتدی ومتوسط فرد اگر دوسروں پر تنقید سے کام لے گا تو وہ حد اعتدال پر قائم نہ رہ سکے گا اور اس تنقید سے اس میں انانیت اور کبر کے جراثیم پیدا ہوں گے۔

نیز اس کا دل اذیت واضطراب سے سرشار ہوجائے گا۔ اس لئے کہ راہ سلوک میں تنقیدی مزاج یا تنقیدی حس سم قاتل ہے، اس سے فرد کا راہ سلوک کا سفر بُری طرح متاثر ہوتا ہے، اور فرد کو خود بھی اس کا مشاہدہ ہوگا کہ اس نے جب بھی جا وبے جا تنقید سے کام لیا، اس کی باطنی کیفیات بُری طرح مجروح ہوئی اور اس کا قلب زیر وزبر ہونا شروع ہوا، اس مشاہد سے اندازہ ہوگا کہ فرد کی شخصیت کی گہرائیوں میں نفس کی مکر وفریب کی حامل قوت موجود ہے، جو دوسروں پر تنقید وتحقیر کے ذریعہ اپنے باطنی جذبات کی تسکین چاہتی ہے۔

۱۰۔ تنقید کے لیے اصلاح کی زیادہ ضرورت کا ہونا

انسانی شخصیت بالخصوص ذہین، باصلاحیت ومتحرک افراد کے تجزیہ وتحلیل نفسی سے معلوم ہوتا ہے کہ بالعموم ان کے اندر ہر وقت ایسی طوفانی لہریں موجزن رہتی ہیں، جو انہیں اپنے ساتھ بہا کر لے جاتی ہیں۔ ان طوفانی لہروں میں ایک بڑی اور خطرناک لہر اپنی فوقیت وبرتری اور دوسروں بالخصوص معاصر شخصیتوں کی تحقیر کا داعیہ ہے۔

یہ داعیہ ایسا ہے، جو آخر وقت تک فرد کے باطن میں تہلکہ برپا کرتا رہتا ہے، معاشرہ میں باصلاحیت ومتحرک افراد کے اسی داعیہ سے تفرقہ پیدا ہوتا ہے۔

فرد کی اپنی اور معاشرہ کی بہتری اس میں ہے کہ فرد ان باطنی جذبات کو حداعتدال میں رکھنے کی کوشش کرے، اگر باطن سے اس طرح کے جذبات مچل کر سامنے آئیں تو صحبت اہل اللہ اور ذکر وفکر کے انوار سے ان کا مقابلہ کرے اور انہیں ابھرنے سے روکے۔

فرد جب تک معاشرہ میں چھوٹا بن کر رہنے کا سلیقہ نہیں سیکھتا، تب تک دوسروں کو چیلنج دینے، ان کے جذبات کو مشتعل کرنے اور انہیں حریف کی حیثیت سے سامنے آکر معاشرہ کی ٹوٹ پھوٹ کا ذریعہ بنتا رہے گا۔

بڑا بننے اور انانیت کی نفسیات دراصل شیطانی نفسیات ہے۔ اس نفسیات کو طاقتور بنانے سے جہاں شیطانی مقاصد کی تکمیل ہوتی ہے، وہاں انا، حسد اور جلن جیسے جذبات فرد کی داخلی شخصیت کو تاریک سے تاریک تر بنادیتے ہیں۔ اس طرح کی صورتحال میں فرد کے دل کو حق وصداقت کے فہم وادراک سے روک دیا جاتا ہے، اگرچہ بظاہر وہ ساری زندگی اسلام کا علمبردار بن کر گذارنے کے لئے کوشاں کیوں نہ ہو۔

بزرگوں کے ہاں اصلاح کی نیت سے آنے والے افراد کے لئے تربیت کا ایسا نظام قائم رہا ہے، جہاں فرد کے لئے بڑے بننے کے سارے راستے مسدود کردیے جاتے ہیں۔ انہیں زیادہ بولنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ انہیں غیر معمولی ذہانت وخطابت کی صلاحیتوں کے باوجود تقریر کی اجازت نہیں ہوتی، انہیں نمایاں ہونے اور اپنی شخصیت کی نمائش سے روک دیا جاتا ہے۔

یہ ساری تدابیر اس لئے کی جاتی ہیں، تاکہ ذہین وباصلاحیت افراد کی انا سے معاشرہ کو پہنچنے والے نقصان سے بچایا جائے اور خود فرد کی اصلاح کی بہتر سے بہتر صورت پیدا ہو سکے۔

اس طرح کی تدابیر اور ذکر وفکر کے مجاہدوں سے جب فرد صحیح بولنے اور گفتگو کے سلیقہ سے آشنا ہوجاتا ہے، دوسروں کے احترام ومحبت کے جذبات کا خوگر ہوجاتا ہے، دوسروں پر تنقید کے سلسلہ میں حکمت وفراست سے بہرہ ور ہوتا ہے، اس کے بعد ہی اسے اجازت دی جاتی ہے کہ اب وہ معاشرہ میں بھرپور طور پر دعوتی کام کا آغاز کرے اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا فریضہ سرانجام دے۔

جب تک فرد تربیتی مراحل سے گزر کر اس مقام تک نہیں پہنچتا، تب تک اسے صبر وضبط کا مظاہرہ کرکے اپنی تنقیدی حس اور اپنے جذبات انانیت سے اپنی داخلی شخصیت اور معاشرہ میں طوفان برپا کرنے سے باز رہے۔

۱۱۔موثر ذاتی اصلاح کے بغیر تنقید نقصان دہ ہے

بدقسمتی سے اب معاشرہ میں جو انقلاب آیا ہے، اس میں ذہین وباصلاحیت ومتحرک افراد کی شخصیت میں موجود انا وحسد وجلن جیسے طاقتور باطنی جذبات کے فہم وادراک اور انہیں ضابطہ میں لانے کا پورا نظام تباہی سے دوچار ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ محلّہ کی سطح سے لے کر شہر اور قومی سطح تک افراد، افراد سے ٹکرا رہے ہیں، گروہ، گروہوں سے متصادم ہیں اور قومیتیں قومیتوں سے صف آرا ہیں۔

دشمن نے جب دیکھا کہ اس ملت کے تعلیمی وتربیتی نظام میں کم سے کم انسانی آداب اور اجتماعی نظام کی سلیقہ سے تشکیل کی صورت موجود نہیں۔ نیز اس قوم کے ذہین وباصلاحیت افراد کا نفس، حالتِ اشتعال میں ہے اور اس کے افراد خرید وفروخت کے لئے تیار ہیں تو دشمن نے پوری منصوبہ بندی کے ساتھ ہمارے ملک کے ہر شعبہ سے وابستہ ذہین افراد کو خریدنا شروع کیا۔ اور انہیں تربیت دے کر قوم کو ایک دوسرے سے متصادم کیا اور قتل وغارت گری کی فضا پیدا کی، ہمارا ملک برسوں سے دہشت گردی، قتل وغارت گری اور بدامنی کی اس صورتحال سے دوچار ہے۔

یہ صورتحال اشتعال کے شیطان کو قابو نہ کرنے، دوسروں کو گمراہ سمجھکر، ان پر بیجا تنقید کرنے کے کام کو وظیفہ سمجھنے ہی کا نتیجہ ہے۔

اس لئے ضرورت ہے کہ اشتعال کے شیطان اور جذباتِ انانیت پر قابو پانے کے کام کو اہمیت دی جائے اور جس قدر ہوسکے، معاشرہ میں چھوٹا بن کر رہا جائے، دوسروں سے احترام ومحبت کا مظاہرہ کیا جائے اور اختلاف رائے کو نظریاتی ارتداد والے اختلاف تک پہنچانے سے احتراز کیا جائے۔

۱۲۔تنقید میں کبر اور انانیت کی آمیزش کا ہونا

بزرگوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ راہ سلوک میں چلتے رہنے اور غیر معمولی مجاہدوں سے فرد کے اندر سے سب سے آخر میں جو چیز نکلتی ہے، وہ دعویٰ، تکبر، اپنی افضلیت کا داعیہ اور بزرگی کا احساس ہے۔ عزازیل کو جس چیز نے شیطان بنایا، وہ تکبر ہی تھا، حالانکہ وہ عابد بھی تھا، عالم بھی تھا اور کسی حد تک عارف بھی۔

دعویٰ وتکبر کی بیماری کے اس قدر سنگین ہونے کی وجہ سے راہ سلوک میں طالب سے ذکر وفکر کے غیر معمولی مجاہدے کروا کر نفس کی فنائیت سے گزارا جاتا ہے۔ برسوں کے مسلسل مجاہدوں کے دوران طالب کو نفس کے مکر وفریب کی ہزارہا چالوں کا مشاہدہ ہوتا رہتا ہے، نفس پرستی کے اس سمندر کو عبور کرنے کے بعد جب وہ حالت بقا میں آتا ہے تو اس کی نفس کی سرکشی اور انانیت کا زور ٹوٹ جاتا ہے، اگرچہ اب بھی نفس کی قوت پوری طرح فنا نہیں ہوتی، وہ موجود ہوتی ہے۔ لیکن اب اس کے حملوں سے فرد بر وقت چوکنا بھی ہوجاتا ہے اور اسے ضابطہ میں لانے کے سلیقہ سے آشنا بھی ہوجاتا ہے۔ تاہم اگر طالب نے اصولوں کی خلاف ورزی کی تو وہ خطرہ کی زد میں آنے لگتا ہے۔

۱۳۔تنقیدی نفسیات کے مفاسد

تنقیدی نفسیات کی ایک ''خصوصیت'' وخرابی یہ ہے کہ اس طرح کے افراد کو اپنے معاصروں میں خرابیوں اور بُرائیوں کے علاوہ کوئی چیز نظر نہیں آتی۔ جب تنقیدی نفسیات اہل سیاست میں آجاتی ہے تو ملک کا وہ حال ہوتا ہے، جو اس وقت ہمارے ملک کا ہے کہ حکمرانوں کو اپنا عرصۂ حکومت پورا کرنے دینے کی بجائے پہلے دن سے ہی اسے ناکام بنانے کی سازشیں شروع ہوتی ہیں۔ اور اس کے لئے آئے دن نیا اودھم برپا کر دیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اس مقصد کے لئے دشمن ملکوں سے مالی تعاون لے کر تحریکیں شروع کردی جاتی ہے اور عورتوں ومردوں کو ساتھ لے کر دھرنے دیئے جاتے ہیں۔

تنقیدی نفسیات جب اہل مذہب میں آجاتی ہے تو اپنی بیشتر قوتیں ایک دوسری کی تردید بلکہ تکذیب میں صرف کردی جاتی ہیں۔ اور اس کام کو دین ومذہب کا حصہ سمجھکر سرانجام دیا جاتا ہے۔ تنقید کی نفسیات دراصل مریضانہ نفسیات ہے، اس نفسیات کے

مریضوں سے اپنی بیماری کا ادراک سلب کر لیا جاتا ہے۔

اس نفسیات میں جو جذبات کارفرما ہوتے ہیں، اس میں خود غرضی، احساس برتری، دوسروں کو شرکا مجسمہ سمجھنے کی ذہنیت، اپنے آپ کو پاک پوتر سمجھنے کی بیماری وغیرہ شامل ہے۔

المیہ یہ ہے کہ معاشرہ کے ہر ذہین، مؤثر، متحرک طبقات میں یہ بیماری پیدا ہوگئی ہے، جس کی وجہ سے ہمارا معاشرہ بُری طرح ٹوٹ پھوٹ اور خلفشار کا شکار ہے۔ دشمن ہماری اس نفسیات سے فائدہ اٹھا کر مؤثر منصوبہ بندی کے ساتھ ہمیں تقسیم کر کے کمزور سے کمزور تر کرنے کی راہ پر گامزن ہے۔ داعش جیسی تحریکیں دراصل تنقیدی نفسیات کے غلبہ کی وجہ سے ہی پیدا ہوتی اور فروغ پذیر ہوتی ہیں، جہاد کے مقدس نام پر ان کا ساتھ نہ دینے والے افراد اور ریاستی نظام سے وابستہ سارے افراد کو کفر کی عالمی طاقتوں کا آلہ کار سمجھکر انہیں قتل کرنا اور اسے عظیم جہادی کارنامہ سمجھنا، یہ دراصل اپنی ذاتی اصلاح کے کام سے بے نیازی اور نفسی قوتوں کے عدم فہم اور فریبِ نفس کا نتیجہ ہے، جس میں افراد دین ومذہب کی خوبصورت آڑ میں مبتلا ہوجاتے ہیں، فرد اگر اندر میں غوطہ زنی سے کام لے تو اسے معلوم ہو کہ جہاد کا سب اولین مستحق تو اس کا اپنا نفس ہے کہ اس کے بتوں کی پرستش حب جاہ وحب مال اس کا وظیفہ بن جاتا ہے۔

۱۴۔ تنقید کا اصلاح کے بعد باعث خیر ہونا

ایسی تنقید جس میں اعتراض کا پہلو غالب نہ ہو، جس میں سختی نہ ہو، اشتعال کا رنگ نہ ہو، جس میں درمندی، رواداری اور اعتدال موجود ہو اور مزاج میں ٹھہراؤ ہو، اور جس میں جذبہ اصلاح واخلاص کا پہلو غالب ہو، یہ تنقید ایسی ہے، جو ضروری ہے، ایسی تنقید سے ہی معاشرہ میں دوسروں کی فکری، علمی وعملی کمزوریوں کو سمجھنے اور صحیح وغلط کو پرکھنے اور عام افراد کو غلط فکر کے بہاؤ میں بہنے سے روکنے کی فضا پیدا ہوتی ہے۔

لیکن اس طرح کی تنقید ہما شما کے بس کی بات نہیں ہے۔ اس کے لئے گہری علمی صلاحیت چاہئے اور اعلیٰ درجہ کی تقویٰ چاہئے اور دوسروں کی تکریم کا مزاج چاہئے۔

جیسا کہ عرض کیا گیا ہے کہ یقیناً تنقید میں افادیت کے پہلو بھی موجود ہیں کہ اس سے صحیح وغلط کو سمجھنے، صحیح اسلامی فکر کی سمت کو قائم رکھنے اور سلف کے قرآن وسنت کے اسلامی فکر کی نوعیت کو سمجھنے اور بدعات وخرافات سے بچنے کی صورت پیدا ہوتی ہے اور اس کی اہمیت وافادیت سے انکار نہیں، لیکن جس تنقید میں مذکورہ بالا آداب وصفات موجود نہ ہوں، وہ تنقید خیر کا ذریعہ بن سکے، مشکل ہے۔

اس لئے کہ اس طرح کی تنقید میں اکثر نفسی خرابیوں اور نفسی فساد کی آمیزش موجود ہوتی ہے۔ نفسی خرابیوں کے ساتھ ہونے والی تنقید چاہے کتنی ہی علمی ہو اور استدلال پر مبنی ہو، اس سے تفریق پیدا ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی یہ وہ اہم نکتہ ہے، جس کا فہم اہل اللہ کی صحبت اور غیر معمولی خود احتسابی کے بغیر ممکن نہیں۔

اس کی حالیہ مثال ترکی کی فتح اللہ گولن کی ''تحریک عزیمت'' سے لگایا جا سکتا ہے کہ یہ تحریک عرصہ سے اصلاحی محاذ پر کام کر رہی تھی۔ اس نے بہت سارے افراد کی اصلاح کا فریضہ سرانجام دیا ہے، لیکن اپنی معاصر اسلامی تحریک جسٹس پارٹی اردگان کی تحریک پر تنقیدی حس کے غلبہ، اور اس میں نفسانیت کی آمیزش کی شمولیت کی وجہ سے یہ تحریک بہت بڑے فساد کا ذریعہ بن گئی کہ دنیا بھر کے مظلوم مسلمانوں کی مدد کرنے اور کفر کی عالمی طاقتوں کو چیلنج دینے والی اردگان کی حکومت کے خلاف فوجی بغاوت پر آمادہ ہوگئی۔

اس طرح محض تنقیدی حس کے غلبہ اور تنقید میں نفسی فساد کی شمولیت کی وجہ سے وہ براہ راست یا بالواسطہ طور پر کفر کی عالمی طاقتوں کی آلہ کار بن گئی۔

اس ایک مثال سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جب تک حریصانہ ورقیبانہ مزاج کی قابل ذکر حد تک اصلاح نہیں ہوتی، اس وقت تک تنقید کا کام ہاتھ میں لینا یا تنقید کو مزاج کا حصہ بنانا، امت میں فتنہ اور بڑے فساد کا پیشہ خیمہ بن سکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ فرد ظاہر سے زیادہ باطن سے عبارت ہے، جس طرح دریا سے مگرمچھوں کو نکالے بغیر دریا میں تیرنا خطرناک ہے، اسی طرح باطن میں موجود مگرمچھوں کا مقابلہ کر کے، انہیں مات کئے بغیر فرد وافراد ان مگرمچھوں کی نذر ہوئے بغیر رہ سکیں، مشکل ہے۔

اس وقت مسلم امت کی اجتماعی حالت زار کا بنیادی سبب یہی ہے کہ افرادِ معاشرہ وہ چاہے مذہبی طبقات ہوں یا جدید اسلامی فکر کے حامل افراد، ان سب میں عام طور پر داخل میں موجود مگرمچھوں کا ادراک وشعور موجود نہیں، جس کی وجہ سے دوسروں کی اصلاح اور خارجی زندگی کی تبدیلی اصل ہدف بن گئی ہے۔

باطن کی وسیع دنیا کی اصلاح کے بغیر تنقیدی حس کی بیداری اور دوسروں کی اصلاح کی فکر اپنے ساتھ جو فساد لاتی ہے۔ وہ یہی فساد ہے، جس کا مظاہرہ اسلام کے نام پر معاشرہ میں ہورہا ہے۔

۱۵۔ حاصل بحث

ہماری اس گفتگو سے یہ تاثر لینا صحیح نہ ہوگا کہ ہم تنقید سے روک کر، فکری جمود اور علمی تعطل پیدا کرنا چاہتے ہیں، بلکہ ہمارا مقصود یہ ہے کہ چونکہ راہ سلوک میں چلنے والے افراد کے لئے تنقیدی حس سخت نقصان دہ ہے، اس لئے انہیں اس سے بچنے کا خصوصی اہتمام کرنا چاہئے۔ راہ سلوک کے باہر کے ذہین افراد کے لئے تنقیدی حس اور تنقیدی مزاج ان کے لئے نفسی یرغمالی کا سب سے مؤثر ذریعہ ہے۔

البتہ معاشرہ میں موجود فکری وعلمی شخصیتوں کی فکر کی نوعیت کو سمجھنا بھی ضروری ہے، تاکہ صحیح وغلط فکر کے درمیاں امتیاز پیدا کرنے کی صلاحیت پیدا ہو سکے۔ اسی لئے امام محمدؒ کا کہنا ہے کہ جو شخص اپنے دور کی علمی شخصیتوں (کے فکر) کو نہیں سمجھتا، وہ جاہل ہے۔ یعنی اپنے دور کی فکری شخصیتوں کی فکر کی کجی کو سمجھے بغیر ان کی فکری کمزوریوں سے بچنا ممکن نہیں۔

اس موضوع پر الحمدللہ ہمارے ادارہ نے کئی اہم علمی کتابیں شائع کی ہیں، جن کے مطالعہ سے بیسویں صدی کی ممتاز علمی وفکری اور جدیدیت سے متاثر شخصیتوں کے فکر کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے، ہماری بعض کتابوں کے نام یہ ہیں۔ (۱) اسلامی فکر، بیسویں صدی میں (۲) برصغیر ہند کے اسلامیات کے ممتاز شارح (۳) عصر حاضر کی شخصیات میری نظر میں (دو حصے) (۴) دینی جماعتوں وشخصیتوں کا علمی جائزہ۔''

ان کتابوں میں مفکروں اور فاضل شخصیتوں کے فکر کے مثبت وکمزور پہلوؤں کا دردمندی، رواداری، حکمت ومحبت سے تجزیہ کیا گیا ہے۔ اس مطالعہ سے جہاں جدید مفکروں اور فاضل شخصیتوں کے فکر کی گہرائیوں کو سمجھنے کا موقعہ ملتا ہے، وہاں اس فکر میں جدیدیت کے اثرات پر رواداری ومحبت سے تنقید کرنے کے سلیقہ سے بھی آشنائی ہوتی ہے۔

تصوف اس کی حقیقت اور اہمیت

تصوف واحسان، صحبت اہل اللہ کے ذریعہ ذکر وفکر میں چلتے رہنے کا ذریعہ ہے، اس سے زندگی میں جو فوائد، برکتیں اور سعادتیں حاصل ہوتی ہیں، وہ ایسی ہیں، جو بیان سے باہر ہیں، وہ قال سے نہیں، حال سے تعلق رکھتی ہیں۔ تصوف کا تعلق چونکہ عمل اور ایمانی حلاوتوں سے ہے، اس لئے تصوف سے باہر کے افراد کو ایمان کی ان حلاوتوں سے استدلال اور قال سے آشنا کرنا دشوار ہے، جو چیز حال سے تعلق رکھتی ہے، وہ الفاظ کے سانچوں میں سما نہیں سکتی۔ تاہم تصوف سے زندگی کا رخ جس طرح بدلتا ہے، فرد اس کے جو فوائد وثمرات محسوس کرتا ہے، اسے الفاظ میں کسی حد تک اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے۔

- اللہ کی محبت کے مراحل طے ہوتے ہیں اور محبت کی حلاوت سے لذتیابی ہوتی ہے۔
- نفس کے خلاف معرکہ آرائی شروع ہوتی ہے اور آئے دن نفس کی بے پناہ قوتوں کا مشاہدہ ہوتا رہتا ہے۔
- زندگی کے ہر معاملہ میں دل کی فتویٰ کا عمل شروع ہوجاتا ہے۔ اندر کا مفتی طاقتور سے طاقتور ہونے لگتا ہے۔
- فرد، اللہ کی جلالی وجمالی صفات کے عکس کے حالات سے گذرنے لگتا ہے، اس طرح وہ محبت کے ارتقائی مراحل طے کرنے لگتا ہے۔
- شروع میں اسلامی شریعت پر عمل کرنا، نفس پر انتہائی شاق گذرنے لگتا ہے، آخر میں اسلامی شریعت، نفس کے لئے حلاوت کا مسئلہ بن جاتی ہے۔
- دنیا میں نفسی قوتوں اور نفسی کارستانیوں کے ذریعہ جو خرابیاں اور مفاسد برپا ہوتے ہیں، فرد، نفسی قوتوں کے ان مشاہداتی مراحل سے گزر کر، انسان کے اندر موجود حیرت انگیز قوتوں پر انگشت بدنداں ہوجاتا ہے۔ نیز وہ انسانی نفسیات کا سب سے بڑا ماہر بن جاتا ہے۔ ایسا ماہر، جس کے سامنے ماہرینِ نفسیات طفل مکتب کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اس لئے کہ نفسیاتی ماہرین، نفس ونفسیات کے حوالے سے عام طور جانتے تو بہت کچھ ہیں، لیکن وہ نفسی قوتوں کو مطیع کرنے کی صلاحیت سے عاری ہوتے ہیں۔

- حمیت دین، فرد کے مزاج کا حصہ بن جاتی ہے۔ اس کی آرزو ہوتی ہے کہ کاش کہ اللہ کی مخلوق، نفسی بتوں کی پرستش سے پاک ومحفوظ ہو اور وہ اللہ کے وفادار بندے کی حیثیت سے زندگی گذارنے کی راہ پر گامزن ہو، اس کا بس نہیں چلتا، ورنہ وہ مادیت پرستی اور نفسی پرستی کی قوتوں اور منکر کو ختم کرکے دم لیتا، تاہم وہ اپنی صلاحیتوں کے تحت اپنے دائرہ کار میں حمیت دین کا مظاہرہ کرتا رہتا ہے۔
- فرد، افراد کی نفسیات سے پوری طرح آشنائی کی وجہ سے دعوتی کام کے سلسلہ میں حکمت وسلیقہ سے کام لیتا ہے۔ وہ افراد کو دور کرنے کی بجائے انہیں اپنے قریب کرنے کے لئے کوشاں ہوتا ہے، اس کے لئے وہ محبت اور بہت وافر محبت کے ہتھیار سے کام لیتا ہے۔
- وہ زہد، وفقر کا صاحب ہوتا ہے اور دنیا واہل دنیا سے استغنا کی راہ پر گامزن ہوتا ہے۔ وہ اپنا قیمتی وقت ضرورت سے زائد دولت کے حصول میں صرف کرنے کا متحمل نہیں ہوتا، اگر دولت اس کے پاس آتی بھی ہے تو وہ اپنے معیار زندگی کو بلند نہیں کرتا، اس کی معاشرت اور معیار زندگی عام زندگی سے مختلف نہیں ہوتی، وہ اس کا خصوصی اہتمام کرتا ہے، اس سلسلہ میں اس کے سامنے اللہ کے رسول ﷺ کی وہ دعا ہوتی ہے، جس میں آپ نے فرمایا کہ یا اللہ، مجھے مسکینوں کے ساتھ زندہ رکھ، مسکینوں کے ساتھ موت دے اور مسکینوں کے ساتھ (آخرت میں) اٹھا۔
- وہ کسی کو بھی اذیت نہیں پہنچاتا، اس سلسلہ میں اس کی حس لطیف تر ہوتی ہے۔
- وہ صبر وشکر کی نفسیات کا حامل ہوتا ہے۔
- اس کا کوئی مخالف نہیں ہوتا۔
- جو افراد اسے نقصان پہنچاتے ہیں، اس کے دل سے ان کے لئے دعائیں نکلتی ہیں۔
- وہ گھر والوں، اہل محلّہ اور دوست واحباب سب کے لئے شفیق ہوتا ہے۔
- اگر اسے دینی علوم میں مہارت حاصل نہیں بھی ہوتی تو قلبی بصیرت، فراست مؤمنہ اور معرفت کی وجہ سے وہ دین کی اصلیت سے آشنا ہوتا ہے۔
- وہ دینی مسائل اور فقہی مسائل کے سلسلہ میں اور تو گہرا علم رکھتا ہے لیکن ایسا نہیں ہوتا تو وہ علمائے کرام سے رجوع ہونے میں کوئی حجاب محسوس نہیں کرتا، بلکہ اسے دین کا اہم تقاضا سمجھتا ہے۔
- عالمی ومقامی سرمایہ داروں کی طرف سے انسانیت کو مصائب میں مبتلا کرنے کی سازشوں کی وجہ سے اس کی دلوں سے آہیں نکلتی ہیں۔
- غریبوں کو دین سے دوری اور افلاس کی حالت میں دیکھکر وہ آزردہ خاطر ہوتا ہے۔
- اگرچہ معاشرہ کی زبوں حالی اور سیاست میں پیدا شدہ خرابیوں کی وجہ سے وہ شدید مضطرب ہوتا ہے اور وہ حالات کو بدلنے کی تڑپ رکھتا ہے، لیکن وہ اپنی محدود صلاحیتوں کی وجہ سے اپنے دائرہ کار سے باہر کا کام ہاتھ میں نہیں لیتا۔
- تصوف کی حقیقت **حَبَّبَ إِلَيْكُمُ الْإِيمَانَ وَزَيَّنَهُ فِي قُلُوبِكُمْ** . ہے (اللہ نے تمہیں ایمان کی محبت دی اور اس کو تمہارے دلوں میں مزین کردیا) نیز **ان تعبدالله كانك تراه.** (اللہ کی عبادت اس طرح کر، گویا تم اسے دیکھ رہے ہو)۔
- تصوف کی اصل اللہ کے لئے جینا اور اللہ کے لئے مرنا ہے، **قُلْ إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ** (تم کہو کہ بے شک میری نماز میری قربانی اور میری زندگی وموت اللہ رب العالمین کے لئے ہے)۔
- تصوف کا حاصل اللہ کو رب کہکر اس پر جم جانا ہے۔ اور ادھر اُدھر کی بھول بھلیوں سے محفوظ ہونا ہے۔ **إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا** ۔
- تصوف کی روح اللہ کے استحضار کا غلبہ، اللہ کے سامنے کھڑے ہونے اور

اس کی جواب دہی کے احساس سے سرشار ہونا اور اس کے خوف سے لرزتے رہنا ہے۔ اور خواہشات نفس سے رک جانا ہے **وَأَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوَى فَإِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَأْوَى.** (اور جو اللہ کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرتا رہا اور خواہشات کو روکتا رہا اس کے راہے کی جملہ جنت ہے)۔

• تصوف کی حقیقت وہ مجاہدہ ہے جو اللہ کی اطاعت میں نفس سے جہاد کی صورت میں ہوتا ہے۔

المجاهد من جاهد من نفسه فی اطاعة الله . (حدیث رسول)

(مجاہد وہ ہے جو اللہ کی اطاعت میں نفس سے جہاد کرے)۔

• تصوف، اللہ کی یاد کو قلب کی گہرائیوں میں مستحکم کرنے اور اندر میں اللہ کے عجائبات کے مشاہدہ کا ذریعہ ہے۔ **وَفِيْ أَنفُسِكُمْ أَفَلَا تُبْصِرُونَ** (ہمارے نشانیاں تمہارے اندر میں موجود ہیں آخر تم دیکھتے کیوں نہیں ہو)۔ یا حدیث شریف کے مطابق **راقب الله تجد تجاهک.** (اللہ کا تصور کرو تو اللہ کو اپنے سامنے موجود پاؤ گے)۔

• تصوف، ہر طرح کے خود وحزن اور رنج وغم کے احساسات سے بچاؤ اور اللہ کی حفاظت میں آجانے کا ذریعہ ہے **أَلَا إِنَّ أَوْلِيَاء اللّهِ لاَ خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلاَ هُمْ يَحْزَنُون.** (جان لو کہ اللہ کے دوستوں کو نہ خود ہوگا اور نہ غمگیں ہوں گے۔

• تصوف، دین وایمان پر استقامت کا ذریعہ ہے **يُثَبِّتُ اللّهُ الَّذِيْنَ آمَنُواْ بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِيْ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِيْ الآخِرَةِ.** (اللہ تعالیٰ اس قول ثابت کی بدولت مومنوں کو ثابت قدم نہ رکھے گا دنیا میں بھی تو آخرت میں بھی)۔

• تصوف، دنیا وآخرت میں ہر طرح کی بھلائیوں کا باعث ہے **لِّلَّذِيْنَ أَحْسَنُواْ فِيْ هَذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ وَلَدَارُ الآخِرَةِ خَيْرٌ .** (نیکو کاروں کے لئے ان دنیا میں بھی بھلائی ہے اور آخرت کا گھر تو بہت زیادہ بہتر ہے)۔

• تصوف، ہدایت وتقویٰ میں اضافہ اور ترقیٔ مزید کا باعث ہے **وَالَّذِيْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى وَآتَاهُمْ تَقْوَاهُم.** (جو ہدایت پر ہیں اللہ ان کی ھدایت اور تقویٰ میں اضافہ کرتا ہے)۔

• تصوف، ہر طرح کے طاغوت کی عبادت سے انکار اور محض اللہ سے لو لگانے کا باعث ہے۔ (اور جنہوں کے طاغوت کی عبادت سے اجتناب کیا اور اللہ کی طرف رجوع ہوئے تو ان کے لئے بشارت ہے)۔

• تصوف، اللہ کی شان عظمت کے استحضار کا اہم ذریعہ ہے، اللہ کی شان عظمت طالب کا اس طرح احاطہ کرلیتی ہے کہ دوسرے سارے شانوں کی ارمان دل سے نکل جاتی ہے اللہ کے شان عظمت کی کمی واضافہ کا عمل فرد کے ساتھ آئے دن جاری رہتا ہے، اس سلسلہ میں اللہ کے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص یہ جاننا چاہتا ہے کہ اللہ کی نظر میں اس کا رتبہ کیا ہے تو اسے چاہئے کہ وہ یہ دیکھ کے اس کے دل میں اللہ کی قدر کتنی ہے۔

صاحب تصوف وہ عقلمند ہونا ہے، جو عارضی دنیا کی محبت کی بجائے داعی دنیا کا آرزومند ہوتا ہے اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا لوگوں میں سب سے زیادہ عقلمند شخص وہ ہے جو دنیا کی محبت سے دستبردار ہونے میں سبقت کرنے والا ہو۔

اللہ کا طالب افراد سے محض اللہ کے لئے محبت کرتا ہے اور اللہ کے لئے ملتا ہے، اس سلسلہ میں اس کی دوسری کوئی غرض نہیں ہوتی۔ حدیث قدسی میں فرمایا گیا ہے میری خاطر محفل سجانے والوں، میری خاطر ایک دوسرے سے ملنے والوں کے لئے میری محبت واجب ہوگئی۔

اللہ کے طالب کو علم برائے علم یا علم برائے دنیا سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی، وہ ایسے علم (ومعرفت) میں محو ہوتا ہے، جس کے ذریعہ اسے اللہ کا قرب حاصل ہوسکے۔

اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا کہ جس نے علم کو غیر خدا کے واسطے حاصل کیا اور علم کے ذریعہ غیر اللہ کی رضامندی ارادہ کیا، اسے چاہئے کہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں تلاش

کرے۔

دوسرے حدیث میں اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا جو شخص اپنے علم پر عمل کرتا ہے، اسے نیا علم عطا کیا جاتا ہے اور جو شخص اپنے علم پر عمل نہیں کرتا اسے علم حیران وسرگرداں رکھتا ہے۔

اللہ کے طالب کو دنیا سے بے رغبتی اور کم گوئی محبوب ہوتی ہے، اور وہ ایسے اہل اللہ کی صحبت کو اپنی سب سے بڑی سعادت سمجھتا ہے، جس سے اس میں یہ صفات غالب ہوں، اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا کہ جب تم دیکھو کہ کسی شخص کو دنیا سے بے رغبتی اور کم گوئی کی صفتیں عطا کی گئی ہیں تو اس کی صحبت اختیار کرو، اس لئے کہ اسے حکمت عطا کردی جاتی ہے۔

یہ وہ صفات وخصوصیات ہیں جو اہل اللہ کی صحبت اور کثرت ذکر کے نتیجہ میں افراد میں پیدا ہوتی رہی ہیں۔ اور اسلام کو یہی ایمانی کیفیات وخصوصیات مطلوب ہیں۔ وہ افراد جو فطرت سلیمہ کے حامل ہیں اور قرآن وعبادت سے گہرا تعلق رکھتے ہیں، ان میں بھی ایمان کی یہ مطلوبہ صفات وخصوصیات پیدا ہوسکتی ہیں، انہیں بھی اللہ کا حقیقی محبّ کہا جانا چاہئے، لیکن تصوف کے مجاہدوں (جو دراصل قرآن وسنت ہی سے ماخوذ ہیں) سے شخصیت میں جو نکھار پیدا ہوتا ہے، اور اللہ کی عبادت میں فنائیت اور کردار میں جو پاکیزگی پیدا ہوتی ہے، اس کی مثالیں تصوف سے باہر کم ہی ملتی ہیں۔

• تصوف نے صدیوں سے معاشرہ میں ان اوصاف کے حامل افراد پیدا کئے ہیں۔ اس طرح معاشرہ کو دینی، روحانی اور اخلاقی طور پر مستحکم کرنے کا کردار ادا کیا ہے۔ موجودہ دور میں مادیت پرستی کی عمومی فضا، عقلیت کے غلبہ اور تصوف میں پیدا ہونے والے بگاڑ کی وجہ سے حقیقی اہل تصوف سے دوری کی فضا پیدا ہوئی ہے، اس لئے معاشرہ ہر طرح کے مفاسد اور بُرائیوں سے بھر گیا ہے، بلکہ لگ بھگ ہر فرد کی حالت غم زدہ کی سی ہوگئی ہے اور ہر گھر غم زدگی کی صورت اختیار کر چکا ہے اور ہر جماعت، ہر تنظیم اور ہر ادارے سے وابستہ افراد روحانی طور پر بے چینی وبے قراری وبے یقینی کے انگاروں پر لیٹنے کی صورت سے دوچار ہیں۔

یہ انتہائی قابل رحم صورت ہے۔ ہمیں اپنے تہذیبی تسلسل کی طرف واپس آنا ہوگا اور اپنے مسلمہ تہذیبی ادارہ سے بھرپور استفادہ کے لئے اس ادارہ کی نوعیت، حقیقت وافادیت کو سمجھنا ہوگا۔ دوسری صورت میں ریاست، معاشرہ، جماعتوں، اداروں اور گھروں کو اذیتناک حالات سے نکالنے کے سارے راستے مسدود ہوجائیں گے (بلکہ بڑی حد تک مسدود ہوگئے ہیں)۔

اہل اللہ قرآن وسنت کے رنگ میں رنگے ہوئے ہوتے ہیں، قرآن وسنت کو جو مثالی انسان مطلوب ہوتا ہے، اہل اللہ نور نبوت کے اجزاء سے بہرہ وری اور نفس کے خلاف غیر معمولی مجاہدوں کی بدولت اس مطلوب انسان کا بڑی حد تک نمونہ ہوتے ہیں۔ ان کی صحبت سے ہی نفسی حجابات وکدورتوں کی صفائی کا عمل شروع ہوتا ہے اور قرآن وسنت کی روح پر عمل پیرا ہونے کی استعداد پیدا ہوتی ہے۔ یہ ہمارا تسلسل ہے، اس تسلسل کو سمجھنے میں جتنی غفلت وتاخیر ہوگی، سعادت دارین سے اتنی زیادہ محرومی ہوگی۔

قرآن وسنت کی بنیادی حیثیت مسلمہ ہے، اس سے انکار ممکن نہیں، لیکن قرآن وسنت کے الفاظ کی ادائیگی یا ان الفاظ کو سنتے رہنے سے نفس کی قوت جو سارے درندوں کی قوت سے بڑھکر ہے، اس سے مقابلہ کرکے، اسے اللہ ورسول کی اطاعت میں دینا ہمیشہ مشکل رہا ہے، اس لئے انسانوں کی رہنمائی کے لئے اللہ نے ہر دور میں کتاب سے زیادہ افراد کا خصوصی اہتمام کیا ہے۔ سوا لاکھ انبیاء کرام کی بعثت اور کل کتابوں وصحیفوں کی تعداد ۱۰۴ ہے اس سے بھی یہ بات واضح ہوتی ہے۔

رسول اللہ ﷺ فرمایا کہ میری امت کے علمائے (ربانی) بنی اسرائیل کے انبیاء کی طرح ہیں، اس حدیث سے بھی شخصیتوں کی اہمیت مسلمہ ہوجاتی ہے۔

اہل تصوف کے کچھ

رہنما اصول

اکابر بزرگوں نے اہل تصوف (جس میں متوسط ومنتہی صوفی شامل ہیں) ان کے لئے جو اصول ضروری قرار دیئے ہیں، ان میں سے کچھ اہم اصول یہ ہیں۔

- شہرت کے ذرائع سے ہر ممکن حد تک بچنے کی کاوشوں کا ہونا۔
- اپنے کسی بھی کام پر داد وتحسین کی نہ صرف یہ کہ امید نہ رکھنا، بلکہ اس کی آرزوں کا بھی نہ ہونا۔
- مریدوں کے مال پر للچائی ہوئی نگاہوں سے بچتے رہنا اور اس کا خصوصی اہتمام ہونا۔
- مالداروں سے دوستانہ تعلقات قائم کرنے کو اپنے لئے سم قاتل سمجھنا۔
- اپنے دور کے امیروں اور شاہوں کی معیاری ومسرفانہ طرز زندگی اور مظاہر زندگی سے بچتے رہنا۔
- زہد وفقر (جس کے بارے میں آقا نے فرمایا، الفقر فخری) کو اپنا شیوہ بنانا اور فقر کی زندگی پر راضی برضا رہنا۔
- لوگوں کو اپنی طرف دعوت دینے سے احتراز کرنا، اپنے کام کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے اور اپنے خلیفوں ومریدوں کے ذریعہ اپنی روحانی پرواز کے قصوں کو پھیلاتے رہنے سے بچتے رہنا اور اس سلسلہ میں سخت روش اختیار کرنا۔
- اپنے کاموں کے بارے میں ڈرتے رہنا کہ کہیں وہ اس مقدس بارگاہ میں اخلاص کے فقداں اور اجزائے ریا کی شمولیت کی وجہ سے مسترد نہ کردیئے جائیں۔
- عاجزی، فروتنی، فنائیت اور اپنے آپ کو مٹانے کی روش پر گامزن ہونا۔
- بالخصوص طالبوں سے ملنے سے بخل اور وقت کی کمی کے عذر کو بہانہ بنانے سے بچتے رہنا۔ اس لئے کہ یہ کام بزرگی اور درویشی کے مقاصد میں شامل ہے۔
- اپنے مریدوں کی تعداد میں اضافہ کی نفسی آرزؤں کو پالنے سے بچتے رہنا اور اس کے لئے وقتاً فوقتاً خوداحتسابی سے کام لیتے رہنا۔
- اپنے کشف ومشاہدات کو زیادہ اہمیت نہ دینا اور اسے بزرگی کا معیار ہرگز نہ سمجھنا۔
- خدمت دین اور دعوت دین کے لئے امت میں ہونے والی ساری کوششوں کو اپنا کام سمجھنا اور ان کاموں کے لئے دل وجان سے ترقی کا خواہاں ہونا اور دعا گو ہونا۔
- دوسروں کے بارے میں بدظنی سے زیادہ حسن ظن کو پیش نظر رکھنا۔
- غلط بات کو غلط سمجھنا، اس کے اظہار کے لئے دردمندی وسلیقہ سے کام لینا۔
- حمیت دین کا مظاہرہ ہونا۔ بالخصوص مادیت پرستی کے بڑھتے ہوئے

طوفان کے بارے میں زیادہ حساسیت کا ہونا اور اس سلسلہ میں حتی الامکان ایسی کاوشوں کا ہونا، جس سے زیادہ سے زیادہ افرادِ امت کے بچاؤ کی صورت پیدا ہو سکے۔

• جدید فتنے جو افرادِ امت کی تباہی کا پیشہ خیمہ ہیں، انہیں سمجھنے کے لئے وقت نکالنا اور اس کے لئے فکرمندی کا ہونا۔

• اپنے دائراتی خولوں میں رہنے کے باوجود اس خول میں بند ہونے سے انکار کی روش کا ہونا اور پوری امت مسلمہ کو یکساں حیثیت سے دیکھنا۔

• امت کے دوسرے گروہوں میں موجود کمزوریوں کو سمجھکر، ان کمزوریوں کو ان کی تکذیب وتردید کا ذریعہ بنانے کی بجائے انہیں کمزوریوں کی مناسبت سے زیادہ حیثیت نہ دینا، تاکہ تقسیم امت کے گناہ سے بچاؤ کی صورت پیدا ہو سکے۔

• خلافت کو بھاری ذمہ داری اور بڑی امانت سمجھنا، اسے فنائیت کے مراحل طے کروائے بغیر عطا کرنے سے احتراز کرنا۔

• خانقاہی سسٹم کو درگاہی سسٹم کی صورت اختیار کرنے سے بچانے کی کاوشوں کا ہونا، تاکہ امت کا یہ ادارہ وراثت درورا ثت کی خرابیوں سے محفوظ ہوکر، افراد امت کی تربیت وتہذیب نفس کا کام بہتر طور پر کر سکے۔

• مریدوں کی بہتر اخلاقی وروحانی تربیت کے لئے ہر ممکن حد تک کوشاں ہونا، تاکہ وہ مادیت پرستی کی طوفانی لہروں کے مقابلے میں مستحکم ہوسکیں اور یہ طوفانی لہریں انہیں ہلا نہ سکیں۔

• اسلامی شریعت سے متصادم روحانیت کے سلسلوں کو عالمی طور پر متعارف کرانے کی کوششوں وسازشوں کو سمجھنا اور اس سلسلہ میں اپنے حلقہ سے وابستہ جدید افراد کی صحیح ذہن سازی کی کاوشوں کا ہونا۔

• حقیقی اہل اللہ، وہ چاہے امت کے کسی بھی گروہ اور حلقہ سے وابستہ ہوں، انہیں اپنا سرمایہ سمجھنا، اس سے کدورت رکھنا سخت مضر ہے۔

• اپنے ہر عمل کے بارے میں اللہ کی رضامندی کے احساس کا غالب ہونا، اگر نفس کی اکساہٹ پر اس عمل میں غیروں کی رضامندی کا احساس بھی شامل ہوجائے تو فورا توبہ واستغفار سے کام لیتے رہنا۔

• قلب کے مفتی کے فتویٰ پر عمل میں غفلت وتاخیر سے ہرگز کام نہ لینا، ورنہ اس عمل کا مزاج کا حصہ بننے اور عادت ہوجانے کا خطرہ لاحق رہے گا۔

وہم کی بڑھتی ہوئی بیماری

اور اس سے بچاؤ کی تدابیر

دور جدید کی بیماریوں میں ایک اہم بیماری وہم کی بیماری ہے، جو فرد کی شخصیت کا اس طرح گھیراؤ کر لیتی ہے کہ آہستہ آہستہ اسے مفلوج کر دیتی ہے۔ اس طرح دیکھتے ہی دیکھتے ایک اچھا بھلا شخص بُری طرح شل ہوجاتا ہے اور جسمانی ونفسیاتی بیماریوں کی نذر ہوجاتا ہے۔

وہم کی مختلف بیماریاں ہیں، جن میں لوگ مبتلا ہوجاتے ہیں، مثلاً ایک شخص کو یہ وہم لاحق ہے کہ لوگ، بالخصوص عزیز واقربا اور دوست واحباب نہ صرف یہ کہ اس سے سنجیدہ نہیں ہیں، بلکہ وہ اسے تحقیر کی نظروں سے دیکھتے ہیں اور اسے گرانے اور معاشرہ میں آگے بڑھنے سے روکنے کا کوئی موقعہ ضایع نہیں کرتے۔

وہم کی ایک بیماری یہ بھی ہے کہ فرد سمجھتا ہے کہ اس پر کسی نے جادو کا عمل کرکے اسے معطل کر دیا ہے اور وہ کسی کام کے اہل نہیں رہا۔ اس عمل نے اسے عملی طور پر معطل کردیا ہے، حالانکہ اس کے حالات کا جائزہ لینے سے معلوم ہوگا کہ وہ خود اعتمادی کے بحران سے دوچار ہے، نیز اسے ذہنی ونفسیاتی بیماریاں لاحق ہیں۔ لیکن وہ عملیات کے اثرات والے وہم سے کسی صورت نکلنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ جس کی وجہ سے وہ صحیح علاج کی راہ پر آنے کے لئے تیار نہیں۔

یہاں وہمی بیماری کے مرض میں مبتلا اس شخص کی مثال بھی دے جا سکتی ہے، جو زیادہ سے زیادہ دولتمند بننے کے جنوں میں مبتلا ہے، منفی فکر کے غلبہ کی وجہ سے وہ اس وہم میں مبتلا ہے کہ اس کے سارے مسائل ومشکلات کے حل کی واحد صورت دولت کے حصول سے وابستہ ہے۔ دولت آئے گی تو اس کی ساری ضروریات پوری ہوں گی، دولت سے اس کے جملہ مسائل ہوں گے۔ دولت ہی اس کے لئے سکون قلبی اور شخصیت میں خود اعتمادی پیدا ہونے کا ذریعہ بنے گی۔ لیکن عملاً ہوتا یہ ہے کہ اس کی ساری توانائیاں اور سرگرمیاں دولت کے لئے استعمال ہونے کے باوجود اس کے مسائل ومشکلات میں اضافہ ہونے لگتا ہے۔

مال وکاروبار میں نفع ونقصان کی فکر اس کی نیندیں اڑا دیتی ہے۔ اس کا دل، دولت کے ساتھ اس طرح اٹک جاتا ہے کہ دولت میں معمولی کمی کی وجہ سے اس کی دل کی دھڑکنیں تیز ہوجاتی ہیں۔ وہ قساوت قلبی کی بیماری کا شکار ہوجاتا ہے۔ اس کے دل سے انسانیت کی قدر وقیمت نکل جاتی ہے، وہ دولت کی خاطر پاکیزہ انسانی اقدار کو پامال کرنے کے مزاج کا حامل ہوجاتا ہے، دولت ایک اعتبار سے اس کے لئے معبود کی صورت اختیار کرجاتی ہے۔

''زیادہ سے زیادہ دولت کا حصول سارے مسائل کا واحد حل ہے۔'' اگر اس کا یہ خیال صحیح ہوتا تو وہ بہت سارے جسمانی، ذہنی، نفسیاتی، اخلاقی اور روحانی مسائل کا شکار نہ ہوتا اور مادیت کی دلدل کی نذر نہ ہوتا۔

وہم کا آخری نتیجہ جو ظاہر ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ صحتمند فکر اور خیر وبھلائی کے حوالے سے بات سننے کی صلاحیت ہی ختم ہوجاتی ہے۔

ایک فرد کو یہ وہم لاحق ہے کہ اس کی جسمانی وروحانی بیماریاں اس نوعیت کی ہیں کہ زندگی بھر کی کوششوں کے باوجود اسے اب تک کوئی ایسا معالج نہیں مل سکا ہے، جو ان بیماریوں کے علاج میں مؤثر ثابت ہو سکے۔ چنانچہ مسلسل معالج تبدیل کرنا، اس کا معمول بن جاتا ہے۔ اس کی تمنا وآرزو ہوتی ہے کہ اس کی جملہ جسمانی وروحانی بیماریوں کے علاج کے لئے ایسا نسخہ کیمیا مل جائے، جس سے ایک عرصہ تک دوا اور پرہیز کئے بغیر اسے مکمل شفایابی نصیب ہو، اس طرح کا مریض جسمانی وروحانی معالج کے قیمتی نسخوں اور قیمتی احتیاطی تدابیر کو ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال لیتا ہے اور ان کی احتیاطی تدابیر پر عمل کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔

اس کے نتیجہ کے طور پر اسے ہر ایک دوماہ بعد معالج تبدیل کرنا پڑتا ہے اور ذہنی طور پر شدید احساسات کا شکار ہونا پڑتا ہے اور مایوسی تک نوبت پیدا ہونے لگتی ہے۔

حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ جسمانی وروحانی بیماریوں کے علاج میں مریض کو اپنے آپ کو مکمل طور پر تجربہ کار معالج کے سپرد کرنا پڑتا ہے۔ وہ اپنے وسیع تجربات کی روشنی

میں اس کی صحت کے لئے جو دوائیں اور احتیاطی تدابیر تجویز کرے گا۔ وہی اس کی شفایابی کا ذریعہ بن سکتی ہیں۔ لیکن چونکہ فرد اس وہم میں مبتلا ہوتا ہے کہ معالج کا طویل علاج اس کے لئے علاج قابل عمل نہیں، اس کی بیماری تو علاج کی مشقت کے بغیر معالج کے فیض نظر سے ہی دور ہوجانی چاہئے۔ حالانکہ جسمانی اور روحانی بیماریوں میں فیض نظر کی بجائے مجاہدوں سے کام لینا پڑتا ہے۔ بڑے بڑے بزرگوں کو بھی غیر معمولی مجاہدوں سے گزارا گیا ہے۔ فیض نظر کی اس نفسیات کی وجہ سے اس طرح کا مریض پوری زندگی معالجوں کی تبدیلی میں ضایع کردیتا ہے۔ اس طرح وہ جسمانی وروحانی بیماریوں کے اعتبار سے شدید تشویش کی حالت میں مبتلا ہوجاتا ہے۔

وہم کی بیماری دراصل ذہن پر غلط فکر کے حاوی ہوجانے کا نتیجہ ہوتی ہے۔ چونکہ انسانی ذہن ہر وقت مصروف عمل ہوتا ہے۔ ۲۴ گھنٹوں میں ذہن ایک ساعت کے لئے بھی سوچ سے محفوظ نہیں ہوتا، نیند کی صورت میں بھی لاشعور کی حالت میں وہ کام کررہا ہوتا ہے، اس لئے انسان جب تک سوچ کو معتدل اور فکر کو متوازن بنانے کے کام کو فیصلہ کن اہمیت نہیں دیتا، تب تک اس کے لئے فکری بھٹکاوٹ اور وہم کی بیماری سے بچنا، دشوار تر ہے۔ اس طرح فکری بھٹکاوٹ اور وہم کی بیماری اس کی شخصیت کو دیمک کی طرح چاٹنے کا کردار ادا کرتی رہے گی۔

اللہ نے انسان کی تخلیق اس انداز سے کی ہے کہ اس کے اندر شر، بدی اور خیر کی قوتیں بیک وقت کام کرتی رہتی ہیں۔ شر وبدی کی قوتوں پر خیر کی قوتوں کو غالب کرنے کے لئے رحمانی قوتوں کی معیت میں مجاہدوں سے کام لینا ناگزیر ہے، اس کے بغیر شر وبدی کی قوتوں پر فتحیابی کی راہیں کھل سکیں، ممکن نہیں۔

کوئی فرد اگر یہ چاہے کہ حق وصداقت کی راہ پر استقامت سے چلے بغیر اس کی شخصیت پر بدی کی قوتوں اور شر کے فکر کا زور ٹوٹ جائے اور اس کے لئے نیکی کی راہیں آسان ہوجائیں نیز وہ خود اعتمادی کے بحران سے بچ سکے اور منفی سوچ کے زیر اثر وہ وہم کی بیماری سے آزاد ہو، مشکل تر ہے۔

اس نکتہ کو **سمجھکر** اپنے آپ کو مکمل طور پر جسمانی اور روحانی معالجوں کے حوالے کرنا، ان کے مشوروں، تجویزوں اور نسخوں کو شفا کے نسخے سمجھنا ضروری ہے، ہر طرح کے وہم سے بچاؤ کی یہی واحد صورت ہے۔

واضح ہو کہ جسمانی ونفسیاتی بیماریوں میں باطنی وروحانی بیماریوں کو غیر معمولی عمل دخل حاصل ہوتا ہے، اس لئے کہ باطنی بیماریوں کی صورت میں سوچ کا رخ غلط سمت میں مڑجاتا ہے، جب یہ غلط سوچ حاوی ہوجاتی ہے تو دل ودماغ شل ہوجاتے ہیں۔ اعضاء وجوارح اور پورے جسمانی نظام میں توازن سے کام کرنے کی استعداد مجروح ہوجاتی ہے۔ باطن اور روح کے استحکام وطمانیت سے جسمانی، نفسیاتی اور اعصابی طور پر بھی فرد مستحکم ہوجاتا ہے۔ اگر کچھ جسمانی بیماریاں لاحق بھی ہوتی ہیں تو، روح کے مستحکم ہونے کی وجہ سے وہ جسمانی بیماریوں کا زیادہ تاثر قبول نہیں کرتا۔ اس لئے کہ زندگی نام ہی خودی (روح کے) استحکام سے وابستہ ہے۔

راہ سلوک میں بھی منفی فکر اور صحتمند فکر کے درمیاں عرصہ تک ٹکراؤ جاری رہتا ہے۔ سالک اگر شب وروز کا کچھ حصہ بھی متوجہ الی اللہ ہونے سے غافل ہوتا ہے تو فورا اس پر منفی فکر حملہ آور ہوکر، اس کے ذہن کو منتشر کردیتی ہے اور اس کے فکری انتشار میں اضافہ کردیتی ہے۔ سالک اگر مسلسل مجاہدوں سے کام لیتا ہے تو ایک وقت ایسا آتا ہے، جب ذکر وفکر کے یہ مجاہدے اس کی سوچ کو بڑی حد تک صحتمند سوچ میں تبدیل کردیتے ہیں۔ لیکن اس دوران اگر سالک نے ذکر وفکر کے مجاہدوں کے دورانیہ میں اضافہ نہیں کیا تو صحتمند خطوط پر اس کی ترقی کا عمل رک جاتا ہے، اور وہ آگے بڑھنے کی بجائے گرنے لگتا ہے۔ اس لئے کہ بہت بڑے پہاڑ کو طے کرنے کا طریقہ یہی ہے کہ مسلسل چلا جائے۔ رکنے کا نام نہ لیا جائے۔ رکنے سے نیچے گرنے کا خطرہ لاحق رہتا ہے۔

صوفیاء کرام کو ہم اکثر دیکھتے ہیں کہ وہ بعض جسمانی بیماریوں اور شدید نقاہت کے باوجود ہمیں نفس مطمئنہ کی حالت میں نظر آتے ہیں، ان کے چہروں پر مسکراہٹ جاری ہوتی ہے۔ اس کا سبب یہی ہے کہ وہ مسلسل مجاہدوں کے ذریعہ منفی سوچ کے مرکز کی اصلاح کرکے صحتمند سوچ کے مرکز کو مستحکم کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ یہ کام انہوں نے جان کی بازی لگا کر کیا ہے۔ ان کی زندگی ہمارے لئے سبق آموز ہے۔ ہم اگر چاہتے ہیں کہ منفی سوچ کی طوفانی لہروں میں زیر وزبر ہونے سے بچ سکیں اور روحانی اور شخصی اعتبار سے صحتمند انسان کی حیثیت سے زندگی گزارنے کے اہل ہوں تو اس کے لئے ضروری ہے کہ

سوچ اور فکر کو صالح بنیادوں پر متشکل دینے کی سعی کریں اور اس راہ میں مزاحم ساری قوتوں کا ہمت وحوصلہ سے مقابلہ کریں۔

(۲)

اس دور کی ایک بڑی بیماری جس میں نوجوان نسل بڑی طرح مبتلا ہے، وہ مصنوعی جنسی اشتعال کی بیماری ہے، جسے زکاوۃ حس بھی کہتے ہیں۔ جس کی وجہ سے معمولی تحرک سے فرد کا جوہر حیات ضایع ہوتا رہتا ہے، اس بیماری کی وجہ سے فرد سراپا وہم بن جاتا ہے اور اس کی وہم کی نفسیات غالب ہوجاتی ہے۔

مصنوعی جنسی اشتعال کی یہ بیماری عالمگیر نوعیت کی صورت اختیار کرچکی ہے۔اس کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ خارجی سطح پر جنسی جذبات کو مشتعل کرنے والے مناظر ومظاہر جو عریانی، فحاشی اور جنس زدگی پر مشتمل ہیں، وہ عام ہیں، اس کی وجہ سے جنسی خیالی قوت میں غیر معمولی تحرک بلکہ طوفان برپا ہوتا رہتا ہے۔ ان خیالات کے غلبہ کی وجہ سے جنسی جذبات فرد کی گرمی وحدت میں اضافہ کرنے کا موجب بنتے ہیں۔

جنسی جذبات ویسے بھی ہر انسان کے باطن میں پوری قوت کے ساتھ موجود رہتے ہیں۔ انسانی شخصیت کے باطن میں جو جنگ برپا ہے، وہ یہ ہے کہ باطن میں موجود دو طاقتور جذبات بیک وقت کارفرما ہیں، جو ہر فرد کا خاصہ ہیں۔ ایک طاقتور جذبہ جسے فرد کا داعیہ حیات کہہ سکتے ہیں، وہ یہ ہے کہ فرد اپنی جوہر حیات یعنی اپنی توانائیاں محبوب حقیقی کے ساتھ محبت میں خرچ کرے اور اس کے ساتھ والہانہ محبت کا مظاہرہ کرکے،اپنی توانائیوں اور اپنے خیالات کی بیشتر قوت اس مقصد کے لئے استعمال کرے، ایسا کرنے سے فرد میں موجود اس کے سارے جذبات کی تسکین کی ازخود صورت پیدا ہوتی جائے گی، وہ سکون قلبی اور خود اعتمادی جیسی نعمت عظمیٰ سے بھی بہرہ ور ہوگا۔ اس حالت میں جنسی جذبات ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھ سکیں گے، اس لئے کہ محبوب حقیقی کے ساتھ عشق کے جذبات سے ان کی روک تھوک کی ازخود صورت پیدا ہوتی جائے گی۔

لیکن عام طور پر فطرت میں موجود اس طاقتور داعیہ کو باطن ہی میں موجود مادی حسن سے فدایانہ ادائیں دبانے کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔ اور خارج میں موجود شہوانہ مناظر اسے مزید تقویت دیتی رہتی ہیں۔

خیال کی قوت ایسی ہے، جو باطن میں موجود شہوانی جذبات کو صحتمند رخ دینے میں بھی معاون ومددگار ثابت ہوتی ہے تو ان جنسی جذبات کو فروغ دینے میں بھی کردار ادا کرتی ہے۔ خیال کی اس قوت کو اللہ کی محبت میں داخل ہوکر، ذکر وفکر اور مخلصانہ عبادت کے ذریعہ صحتمند رخ دینے کے نتیجہ سے فرد میں وہ قوت پیدا ہوتی ہے، جس سے صالح فکر طاقتور ہوتی ہے اور صالح فکر سے صالح اور مصلح انسان وجود میں آتا ہے۔

زکاوۃ حس اور مصنوعی جنسی اشتعال کی بیماری دراصل خیال کی حفاظت نہ کرنے اور اسے بے لغام چھوڑنے کے نتیجہ میں ہی پیدا ہوتی اور فروغ پذیر ہوتی ہے۔ اس طرح ایک وقت آتا ہے کہ فرد کی وہ حالت ہوجاتی ہے کہ مخالف جنس کا تصور کرتے ہی اس کی جوہر حیات ضایع ہونے لگتی ہے۔

زکاوۃ حس اور مصنوعی جنسی اشتعال سے بچاؤ کی سب سے مؤثر صورت یہ ہے کہ فرد جنسی مناظر اور مادی حسن کے خارجی مناظر سے بھی بچاؤ وحفاظت کی کوشش کرے تو باطن میں موجود جنسی جذبات کو بھی ذکر وفکر کے ذریعہ حد اعتدال میں رکھنے کے لئے کوشاں ہو۔

(۳)

وہمی خیالات کے غلبہ کے نتیجہ میں فرد وافراد جس حالت سے دوچار ہوتے ہیں، وہ انتہائی قابل رحم حالت ہوتی ہے۔ مختصرا اس کی تصویر کشی اس طرح کی جاسکتی ہے۔

(۱) شخصیت خوداعتمادی کے بحران سے دوچار ہوجاتی ہے۔

(۲) فرد کی قوت ارادی کمزور سے کمزور تر ہوجاتی ہے۔

(۳) کام کی صلاحیت اور قوت کارکردگی میں کمی آ جاتی ہے۔

(۴) اعصابی نظام بالخصوص متوسط عمر کے حامل افراد اعصابی نظام ٹوٹ پھوٹ جاتا ہے۔

(۵) جسمانی صحت یا روحانی صحت کے حوالے سے صحیح راستہ کے فہم کی استعداد سلب ہوجاتی مسدود ہے۔

(۶) گومگو، مایوسی، بے بسی، اپنے ازحد قابل رحم ہونے اور اس بحران سے نکلنے کے سارے راستے مسدود ہونے کی نفسیات غالب ہوجاتی ہے۔

یہ سارے حالات ونتائج ایک ہی غلطی کا نتیجہ ہوتے ہیں، وہ غلطی باطن میں موجود پاکیزہ فکری لہروں اور پاکیزہ جذبات پر غلط فکری لہروں اور غلط جذبات غالب کرنے کے کام سے بے اعتنائی کی روش ہے اور اس کام کو اہمیت نہ دینا ہے۔ اب چونکہ منفی خیالی قوت غالب آ کر، باطن میں موجود قوتوں کے صحتمند مرکز کو مضمحل کر چکی ہے، اس لئے فرد کا صحیح فکری خطوط پر سفر کا عمل از حد دشوار ہے۔

اس بحران سے نکلنے کے سلسلہ میں اب فرد کے لئے دو ہی صورتیں موجود ہیں۔ جنہیں اختیار کرکے وہ اس بحران سے نکل سکتا ہے۔ ایک صورت تو یہ ہے کہ وہ اپنے جسمانی نظام کی بہتری کے لئے تجربہ کار جسمانی معالج سے رجوع ہو، بلکہ اپنے آپ کو مکمل طور پر اس کے سپرد کردے اور کچھ عرصہ تک اس کی ہدایات کی مکمل پابندی کرے، تاکہ اس کے مضمحل جسمانی نظام میں بحالی کی کچھ صورت پیدا ہوسکے۔

دوسری تدبیر یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو تجربہ کار روحانی استاد کے حوالے کرے، تاکہ وہ فہم وفراستہ کے ساتھ اس کے لئے ذکر وفکر ومجاہدوں کا ایک ایسا مختصر لائحہ عمل تیار کرے، جو اس کی جسمانی حالت کے پیش نظر اس کے لئے قابل عمل ہو اور جس سے بتدریج اس کی خیالی قوت میں پاکیزگی کی صورت پیدا ہوسکے۔

فرد جب تک یہ دوصورتیں اختیار کرکے خود رائی سے دستبردار ہوکر جسمانی اور روحانی معالجوں کے سامنے اپنے آپ کو پامال نہ کرے گا، اس وقت تک اس کے لئے اس بحران سے نکلنے کے سارے راستے مسدود ہوں گے۔

شہرت کی بیماری اور
اس کے اثرات ونتائج

فرد کو تشہیر اور پبلسٹی سے ڈرتے رہنا چاہئے، اس لئے کہ تشہیر کی بیماری کی وجہ سے ادراک ہوئے بغیر فرد کو اس کے نفس کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا جاتا ہے اور نفس اسے تاویلی صورتوں میں مبتلا کرکے عظیم داعیٔ اسلام اور عظیم بزرگ ہونے کی مسند پر فائز کردیتا ہے۔ اللہ کو بندہ کی جو ادا پسند ہے، وہ یہ ہے کہ ساری زندگی فروغ دین میں صرف کرنے کے باوجود وہ اپنے کام کو ہیچ سمجھے۔

جب اپنے کام اور اپنی شخصیت کے بارے میں اس طرح کی نفسیات مستحکم ہوجاتی ہے تو اس طرح کی شخصیت کو اللہ تعالیٰ چمکاتا ہے اور نہ چاہتے ہوئے بھی اسے مقبولیت اور ہر دلعزیزی عطا فرماتا ہے۔

شہرت کے لئے پبلسٹی کے ذرائع اختیار کرنا، اپنے تھوڑے سے کام کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنا، یہ نفس کی مخفی چالوں میں سے ایک چال ہے، جو فرد کے لئے سم قاتل ہے، اس سے بظاہر معتقدوں کی ٹیم کے ساتھ دولت بھی حاصل ہوسکتی ہے، لیکن شخصیت سے خیروبرکت کے اٹھ جانے کے ساتھ ساتھ اسے ابتلا وآزمائش میں مبتلا کرنے کا شدید خطرہ دامنگیر رہتا ہے اور اسے تشہیری ذرائع اور اپنی ذات کی شہرت میں مگن کردیا جاتا ہے۔ بڑے خسارہ کا سودا ہے۔

نیکوکاری کے روپ میں تشہیری کاوشیں نفس کا ایسا حربہ ہے، جس سے آگاہی وآشنائی انتہائی مشکل کام ہے، اس لئے کہ نفس، فرد کو اس کام کو دعوت کے پھیلاؤ، روحانیت کے فروغ اور اشاعت اسلام کی صورت دے کر اس راہ پر گامزن کرتا ہے۔ نفس کے اس طرح کے مکر وفریب سے واقفیت کے لئے ایسے روشن ضمیر فرد (جسے اللہ کا کامل ولی کہنا زیادہ صحیح ہوگا) اس کی مسلسل صحبت کی ضرورت ہے، تاکہ اس کے قلب میں موجود اخلاص، للھیت، حکمت، اور کثرت ذکر کی شعائیں منتقل ہوسکیں اور ان شعاؤں کی روشنی میں فرد اپنے نفس کی گہرائیوں میں موجود مکر وفریب کی قوتوں کا مشاہدہ کرسکے اور اس سے بچنے کی اس میں استعداد پیدا ہوسکے۔

ڈپریشن کا بڑھتا ہوا مرض

علاج و تدابیر

ڈپریشن اور بڑھتے ہوئے ذہنی دباؤ کے موضوع پر ''بیداری'' میں شائع ہونے والے مختلف مضامین یہاں یکجا دیئے جارہے ہیں۔

اگرچہ ان مضامین کے مواد میں تکرار محسوس ہوگا، تاہم چونکہ بڑھتا ہوا ذہنی دباؤ جدید انسان کا سب سے بڑا اور پیچیدہ مسئلہ ہے، اس لئے اس موضوع پر تفصیلی گفتگو ضروری تھی، تاکہ اس بیماری سے بچاؤ کے لئے صحیح خطوط پر سوچ کا عمل شروع ہوسکے۔

دور جدید میں دوسری بیماریوں کے ساتھ ساتھ ڈپریشن کی بیماری غیرمعمولی طور پر بڑھ گئی ہے اور عالمگیر صورت اختیار کرچکی ہے۔ دنیا کا کوئی کونہ، کوئی گوشہ اور کوئی گاؤں اور شہر کا کوئی محلّہ ایسا نہیں ہے، جہاں ڈپریشن کا مرض عمومی صورت اختیار نہ کرچکا ہو۔ چونکہ جدید نفسیات کے فلسفۂ زندگی کی بنیادیں خالص مادی نوعیت کی ہیں، اس لئے وہ انسانی شخصیت کی گہرائیوں میں موجود حقیقی جذبات واحساسات اور اس کی اصلیت ونوعیت کو سمجھکر، اس کے علاج کی صحیح فکر کرنے کی بجائے مادی نوعیت کے طور طریقوں اور حکمت عملی سے ڈپریشن کا علاج کرنے کی راہ پر گامزن ہے۔ مسلم معاشرہ میں صدیوں سے لوگوں کی ذہنی تربیت اس طرح ہوتی ہے کہ اول تو یہ بیماری ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھتی تھی، اگر بڑھتی بھی تھی تو اس کے علاج کی آسانی سے صورت پیدا ہوجاتی تھی، ذیل میں ڈپریشن کے سلسلہ میں مسلم نفسیات کا موقف پیش کیا جارہا ہے۔

مسلم نفسیات، جس کی تاریخ چودہ سو سال پر محیط ہے، اس کا کہنا ہے کہ انسانی شخصیت دو طاقتور رجحانات ومیلانات سے عبارت ہے۔ انسانی شخصیت کو بنانے، بگاڑنے اور اس کے مزاج کو متوازن وغیرمتوازن بنانے میں ان دونوں طاقتور میلانات کا فیصلہ کن کردار ہے۔ ان دونوں کو نفسانی ورحمانی قوتوں سے عبارت کیا جاتا ہے، جو لاشعور یعنی باطن کی گہرائیوں میں موجود ہیں۔ طاقتور منفی جذبات واحساسات اور طاقتور مثبت میلانات ورجحانات کا مرکز یہ لاشعور یعنی باطن ہی ہے۔ نفسانی وشیطانی قوتوں اور رحمانی قوتوں کے درمیاں ٹکراؤ کا عمل تخلیقی یعنی پیدائشی نوعیت کا ہے، فرد کی بچپن سے جس ماحول میں نشوونما ہوتی ہے، وہی ماحول لاشعور میں موجود ان احساسات ومیلانات ورجحانات کی فروغ پذیری اور غلبہ کا ذریعہ بنتا ہے۔ چونکہ عام طور پر فرد کو بچپن سے نفسانی جذبات کے مظاہرہ ومناظر اور نفسانیت سے عبارت ماحول ملتا ہے، اس لئے فرد کے لاشعور میں شروع سے مادی جذبات واحساسات کی فروغ پذیری اور ان احساسات کے مچلتے رہنے کے عمل کا غلبہ ہونے لگتا ہے، یہی جذبات آگے چل کر، فرد کی شخصیت کو حاسدانہ کارروائیوں، اپنی فوقیت کے لئے کاوشوں، جنسی جذبات کے بے لاگ مظاہرہ اور دوسروں کی تحقیر وغیرہ کی راہ پر گامزن کرتی ہیں۔ اس طرح یہ طاقتور منفی احساسات اور منفی نوعیت کی سرگرمیاں لاشعور میں ایسا تہلکہ برپا کردیتی ہیں، جس سے شعور، غیرمعمولی تناؤ اور حالت دباؤ کا شکار ہوجاتا ہے اور فرد وافراد مریض ہوجاتے ہیں۔

مسلم نفسیات کا کہنا ہے کہ اگر فرد وافراد کو بچپن سے لاشعور میں موجود طاقتور مثبت میلانات ورجحانات کے فروغ پذیری کا موقعہ ملتا رہے اور شخصیت کی تربیت اور تعمیر میں ان مثبت میلانات سے کام لے کر، ان کو طاقتور بنایا جائے تو لاشعور یعنی باطن کی دنیا ایسی روشن ہوجاتی ہے، جس سے نہ صرف باطن میں موجود منفی قوتوں پر غلبہ پاکر، شخصیت کے توازن کو قائم برقرار رکھا جاسکتا ہے، بلکہ اس سے فرد وافراد روشن کردار کے حامل بھی بن جاتے ہیں۔ ایسا روشن کردار، جس سے انسانی معاشرہ پاکیزگی سے عبارت بن جاتا ہے۔ اس طرح معاشرہ میں نفسیاتی مریضوں کی پیدائش ونشوونما کا عمل ازخود رک جاتا ہے۔

لاشعور یعنی باطن میں موجود پاکیزہ محبت کے جذبات (جو انسان کو دوسری مخلوق سے ممتاز بناتے ہیں) انہیں نہ سمجھنے کا نتیجہ ہے کہ جدید نفسیات غلط رخ پر چلی گئی ہے، نفسیاتی ماہروں کی اس غلط تحقیق نے ہی تعلیمی وتربیتی اداروں اور میڈیا کے ذریعہ انسانی شخصیت کی صحیح نوعیت اور اس کے حقیقی تقاضوں کو سمجھنے اور اس کی تسکین کی راہ میں غیرمعمولی رکاوٹیں پیدا کردی ہیں۔ اس طرح انسانی معاشرہ نفسیاتی مریضوں کے معاشرہ میں تبدیل ہوگیا ہے۔

مسلم نفسیات کے ماہروں کا کہنا ہے کہ انسان کی تخلیق کچھ اس طرح واقع ہوئی ہے کہ اس میں محبوب حقیقی سے محبت کے لازوال جذبات کو بھر دیا گیا ہے۔ انسان کے دوسرے سارے جذبات اسی ایک جذبہ کے تابع کردیئے گئے ہیں۔ اگر پاکیزہ محبت کے جذبات کی تشفی وتسکین کا اہتمام کیا گیا اور ان جذبات کو نشوونما دے کر ارتقا کے آخری مقام تک پہنچایا گیا تو گویا انسان کے سارے جذبات کی تسکین کی صورت پیدا ہوگئی۔ اس کے بعد لاشعور سے منفی جذبات واحساسات یا اس کی پرانی یادیں اٹھکر فرد کے شعور کو تہہ وبالا کریں، یہ ممکن ہی نہیں، اس لئے کہ جب لاشعور یعنی باطن درندوں سے خالی ہوگیا، وہ پاک وصاف اور مہذب ہوگیا تو اس کی طرف سے پیدا شدہ دباؤ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس طرح لاشعور یعنی باطن کے تہذیب کے عمل سے بڑھتے ہوئے ڈپریشن کے مرض سے ازخود نجات کی صورت پیدا ہوجاتی ہے۔

افسوس ہے کہ انسانی لاشعور کی صحیح نوعیت کو نہ سمجھنے والوں کا تعلیم تربیت اور میڈیا پر اتنا غلبہ ہوگیا ہے کہ مسلم نفسیات کے ماہروں کے اس نقطہ نگاہ کو میڈیا سے شرح وبسط سے پیش کرنے کی صورتیں ہی مسدود ہوگئی ہیں، اسی کی یہ سزا ہے، جو انسانیت بھگت رہی ہے کہ بڑھتی ہوئی نفسیاتی بیماریوں سے بچاؤ اور اس کے علاج کی صورتیں ناپید ہوگئی ہیں۔ اور انسانی نفسیات میں پیدا کردہ ایک آگ ہے، جس میں آج انسانیت جل رہی ہے۔

مسلم نفسیات میں ڈپریشن کے بڑے سے بڑے مریضوں کا ایسا تسلی بخش انتظام موجود ہے کہ جدید نفسیات کے ماہروں کے ہاں اس کا تصور بھی دشوار ہے۔ مسلم نفسیات میں ڈپریشن کے مریض کو کہا جاتا ہے کہ وہ مسلم ماہر نفسیات (جسے روحانی استاد اور مربی کہا جاتا ہے) اس کی صحبت میں مسلسل آتا رہے، روزانہ نہیں تو کم از کم ہفتہ میں ایک بار ضرور آتا رہے، اور اپنے آپ کو مریض سمجھکر آتا رہے اور اپنی شخصیت کو مکمل طور پر روحانی استاد کے حوالے کردے، صحبت کے اس عمل سے روحانی استاد کے لاشعور یعنی باطن سے طاقتور مثبت شعائیں اٹھکر، مریض کے لاشعور کو بدل کر، اسے مثبت بنانے اور اس کے شعور اور اس کے رخ کو بدلنے میں کردار ادا کرتی رہیں گی۔ اس کے ساتھ ساتھ مریض کو اسم ذات کا ذکر بھی دیا جاتا ہے، اس ذکر کے اہتمام سے اس کے قلب میں لازوال ہستی کے انوار حسن کا ورود ہونے لگتا ہے، جس سے لاشعور میں موجود منفی قوتوں کے خلاف جنگ کا عمل شروع ہونے لگتا ہے۔

صحبت اور ذکر کے عمل سے ڈپریشن میں محسوس شدہ کمی آنا شروع ہوجاتی ہے اور نئی زندگی کا احساس مریض کو خوشیوں سے سرشار کرنے لگتا ہے۔

مسلم نفسیات کے ماہروں یعنی روحانی استادوں کا کہنا ہے کہ پاکیزہ صحبت اور ذکر کے عمل میں اصل نیت تہذیب نفس اور محبوب حقیقی کی رضامندی کی ہونی چاہئے، فرد اس نیت سے صحبت اختیار کرے گا تو اسے حیاۃ طیبہ یعنی، پاکیزہ زندگی اور لذیذ ترین زندگی کی نعمت عظمیٰ حاصل ہوگی، اور آج انسانیت کا جو جوہر رخصت ہوگیا ہے، اس جوہر سے بہرہ وری کی صورت پیدا ہوگی۔

آج مغرب کے مادہ پرست انسان کی مادی نوعیت کی زندگی اور اس کے رنگ ڈھنگ اور طور واطوار کو دیکھکر مسلم معاشرہ بھی اسی مادی زندگی کی نقالی کی راہ پر گامزن ہے۔ اس خالص مادی زندگی کے لازمی نتائج جو وہاں ظاہر ہو چکے ہیں، وہ مادی چیزوں پر فدا ہونا، حرص و ہوس کے نہ ختم ہونے والے جذبات کا ہونا، بے لاگ جنسی جذبات کا اشتعال، مروت ووفاداری کے پاکیزہ جذبات کے خاتمہ جیسی چیزیں ہیں۔ ڈپریشن دراصل ان پاکیزہ جذبات واحساسات کے خاتمہ کے ذیلی نتائج ہیں۔ خالص مادی نوعیت کا کردار اور زندگی میں مادی نوعیت کی رونق اپنے ساتھ ڈپریشن لاتی ہے۔

مسلم نفسیات کے ماہروں کی نظر میں ڈپریشن جیسی بیماریوں سے بچاؤ کی واحد صورت یہی ہے کہ ہم علمائے ربانی کی صحبت اور ذکر کے ذریعہ لاشعور یعنی باطن کو صحتمند رخ دیں اور اس کی صحتمند خطوط پر تربیت کا اہتمام کریں۔ اس سے جہاں ہمیں ذہنی دباؤ جیسے جملہ بحرانوں سے نکلنے میں مدد ملے گی، وہاں اپنی پاکیزہ اقدار اور پاکیزہ تہذیب پر

عمل پیرا ہونے کی صورت بھی پیدا ہوگی۔

مسلم ماہرین یعنی علمائے ربانیین کا کہنا ہے کہ ذکروفکر اور مخلصانہ اطاعت کے ذریعہ اللہ سے محبت کے جذبات سے محرومی کے نتیجہ میں فرد وافراد کو جو سزا ملتی ہے، وہ ناقابل برداشت اذیت اور بہت المناک ہوتی ہے۔

اس سزا کی نوعیت کچھ اس طرح ہوتی ہے۔

شخصیت میں ٹوٹ پھوٹ کا عمل شروع ہوتا ہے۔ اور احساسات کی دنیا بہت نازک ہوجاتی ہے۔ معمولی مادی نقصان اور معاشرتی نوعیت کے معمولی واقعہ معاملہ کے خلاف مزاج ہونے سے دل کا نظام درہم ہونے لگتا ہے۔

خواعتمادی کا بحران واقع ہوجاتا ہے اور زندگی کے معاملات میں فرد، صحیح سمت میں مثبت فیصلہ کرنے کی صلاحیت سے محروم ہوجاتا ہے۔

دل، ذہن اور نفسیات میں چند روزہ زندگی کے مستقبل کے سلسلہ میں خوف وہراس اور بے یقینی کی فضا پیدا ہونے لگتی ہے۔ اسی خوف وہواس سے ڈپریشن پیدا ہوتا اور فروغ پذیر ہوتا ہے۔

فرد پر اپنی بڑائی اور دوسروں کی تحقیر کے خیالات غالب رہنے لگتے ہیں۔

اشتعال، چڑچڑا پن، جھنجھلاہٹ اور عدم برداشت کا رویہ مزاج کا حصہ ہونے لگتا ہے۔

مادی حسن پر فدائیت کا رنگ غالب ہونے لگتا ہے۔

دل حسین تصویروں اور مادی نوعیت کی حسین چیزوں میں اٹکتا اور الجھا رہتا ہے۔

آخرت کی بہتری کے فکر کی بجائے دنیا کی فکر مسلط ہوجاتی ہے۔

عزیز واقارب اور افراد سے معاملات اور رویوں میں توازن اور سلیقہ کے بجائے اشتعال، جذباتیت اور عدم توازن کے میلانات کا غلبہ ہونے لگتا ہے۔

معمولی سے معمولی مادی نقصان اور مزاج کے خلاف رویوں سے قلب پر قیامت سے پہلے قیامت کا منظر قائم ہونے لگتا ہے۔

تفکرات ووسوسات گھیرے رہتے ہیں اور ان سے چھٹکارے کی ساری راہیں مسدود ہوجاتی ہے۔

اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا ہونا اتنا دشوار ہوتا ہے، جیسے ھمالیہ پہاڑ طے کرنا ہو۔

حیوانی وجبلی جذبات کے زیر اثر نہ چاہتے ہوئے بھی حیوانی وجبلی رویوں اور مظاہرہ کا صدور ہونے لگتا ہے۔

قربت کے رشتوں کا تقدس مجروح ہونے لگتا ہے۔

فرد وافراد، ذہنی طور پر مفلوج، قابل رحم اور آدھے مجنوں کی حالت تک پہنچنے لگتے ہیں۔

مذہب کے نام پر تعصّبات، گروہ بندی اور دوسرے مذہبی گروہوں کے خلاف مارا ماری کی حالت طاری ہونے لگتی ہے اور جو قوتیں نفس اور مادیت کے خلاف جہاد میں صرف ہونی چاہئے، وہ قوتیں اپنے مخالف مذہبی گروہوں کو کمزور کرنے میں صرف ہونے لگتی ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

کتنی بڑی سزا ہے، جو اللہ سے محبت سے محرومی کے نتیجہ میں ملتی ہے۔ بیدار ہونے اور سنبھلنے کی سخت ضرورت ہے۔ ورنہ حالتِ ڈپریشن کے غلبہ کے ساتھ ساتھ دنیا وآخرت دونوں کے خسارہ سے دوچار ہونا پڑے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ کامیابی کے سارے راستے لاشعور یعنی باطن کو مہذب اور منور بنانے سے ہی گزرتے ہیں۔ اسی سے نفس کی بے لاگ قوتیں تابع ہوتی ہیں۔ اسلامی شریعت پر عمل پیرا ہونا آسان ہوجاتا ہے، بلکہ لذت کا مسئلہ بن جاتا ہے، مادی حسن پر فریفتگی سے بچاؤ اور مادی مفادات سے بلندی کی صورت پیدا ہوتی ہے، انسانیت کے سلیقہ سے بہرہ وری ہوتی ہے۔ توحید کے عقیدہ پر رسوخ کا ملکہ حاصل ہوتا ہے۔ اور ہر طرح کے ذہنی دباؤ سے بچاؤ کی صورت پیدا ہوتی ہے، لاشعور یعنی باطن کو مہذب بنانے کے سارے راستے ذکر وفکر کے ذریعہ محبوب حقیقی سے محبت کے جذبات کو فروغ دے کر، انہیں ارتقائی صورت دینے سے وابستہ ہیں۔ اور ذکر وفکر کے مزاجی سانچہ کی تعمیر کا کام اہل اللہ کی صحبت کے ذریعہ ہی سرانجام ہوتا ہے۔ یہی امت کا تسلسل ہے، اب تک مسلم امت اگر اپنے تہذیبی تسلسل کو قائم رکھنے میں کامیاب ہوئی ہے تو وہ قرآن وسنت کی موجودگی کے ساتھ ساتھ دنیا سے بے نیاز اور شریعت پر گامزن اہل اللہ کی صحبت ہی کا ثمرہ ہے۔ اس وقت ہم اگر اپنی نسلوں کو دینی، اخلاقی اور تہذیبی اعتبار سے سنبھالنے میں ناکام ہیں اور انہیں عالمگیر

مادیت پرستی کی طوفانی لہروں کے زیر اثر ڈپریشن کے نذر ہونے سے بچانے میں ناکام ہیں تو اس کا بنیادی سبب اللہ کی محبت کے رازدانوں یعنی اہل اللہ سے دوری، بلکہ انہیں غیر اہم اور حقیر سمجھنے کی روش ہی ہے۔

اس سارے تجزیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ڈپریشن ایک جزوی نتیجہ ہے، لاشعور کی مادی قوتوں پر فریفتگی، مادی زندگی کو درپیش خطرات اور نفس پرستی کے بتوں کی پرستش کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی تاریکی وظلمات کا۔ بدقسمتی سے لاشعور کی مادی قوتوں کے ساتھ ساتھ مادہ پرستی کی عالمی قوتوں نے میڈیا، روزگار کے جملہ ذرائع ووسائل پر قبضے اور ذہن سازی کے سارے ذرائع پر تسلط کی وجہ سے لاشعور کی قوتوں میں شدید اشتعال پیدا کرکے صورتحال کو سنگین سے سنگین تر کر دیا ہے۔

المیہ یہ ہے کہ تہذیب جدید اور اس کے علمبرداروں نے میڈیا کے تیز ذرائع اور مادی زندگی کے مظاہر ومناظر کے ذریعہ لاشعور کی قوتوں کو مشتعل کرکے افراد کی زندگی میں سرایت شدہ زہر کے ازالہ کا جو طریقہ اختیار کیا ہے، وہ خالص مادی نوعیت کا ہے۔ یعنی مادی نوعیت کی مشقوں کے ذریعہ لاشعور کے جذبات میں پیدا شدہ تلاطم کو کنٹرول کرنے کی کوشش کرنا، اس کوشش کی مثال ایسی ہے، جیسے شیر کو مشتعل کرنے کے بعد معمولی ہتھیار یا لکڑی کے ذریعہ اس کے خونخوار حملہ سے بچنے کی سعی کرنا۔

۲۔ ذہنی دباؤ اور بے یقینی سے بچاؤ کی یقینی صورت

جب دل وروح بے چین ہوتے ہیں تو خطرات، وسوسے، خدشات، بے یقینی اور اپنے معاشی مستقبل کے خطرات لاحق ہونے لگتے ہیں۔

ان خطرات کی دوری کی صورت ایک ہی ہے، وہ ذکر وفکر کے ذریعہ دل وروح کو محبوب حقیقی کے انوار حسن کی خوراک دیتے رہنا اور اخلاص اور پوری توجہ سے اس کی اطاعت بجالانا ہے، خطرات، بے یقینی اور وسوسوں سے بچنے کی اس کے علاوہ کوئی صورت نہیں ہے۔

صوفیاء، جو نفسی قوتوں کا ہمالیہ پہاڑ طے کر چکے ہوتے ہیں اور جو نفسی بیماریوں کے حکماء ہیں۔ خطرات کے بارے میں ان کا تجزیہ یہی ہے۔ طالب کو ہر طرح کے خطرات ووسوسوں کے بارے میں ان کے تجویز کردہ نسخہ کو استعمال کرکے تشفی کا یقین رکھنا چاہئے۔

طالب پر جس وقت بھی بے چینی اور مستقبل کے حوالے سے خطرات لاحق ہوں اور وہ سخت دباؤ کا شکار ہو، اسے حوصلہ وہمت سے کام لے کر، ذکر وفکر کے نسخہ کو استعمال کر لینا چاہئے، ان شاء اللہ، سارے خطرات جو اس کی نفسیات میں بگاڑ اور اس کے دماغ کو مفلوج کر دیتے ہیں، دور ہوجائیں گے، اس لئے کہ ذہن، نفسیات اور انسانی مزاج سب دل وروح کے تابع ہیں۔ اور دل وروح، وہ جوہری حقیقت ہیں، جو محبوب حقیقی سے رابطہ کے لئے ہمہ وقت مضطرب رہتے ہیں۔ انہیں جب محبوب حقیقی کے ذکر کی خوراک ملنے لگتی ہے تو ان کے اضطراب میں کمی واقع ہونے لگتی ہے۔ اور ان میں ٹھہراؤ آجانے سے ذہن، اعصاب اور نفسیات میں بھی ٹھہراؤ اور توازن آجاتا ہے۔ فرد وافراد لاکھوں تجربے کرکے دیکھ لیں، بے یقینی اور خطرات سے نجات کی صورت کا پیدا ہونا ممکن نہیں۔

اضطراب ایسی چیز ہے، جو فرد وافراد کو نفسی قوتوں کی گرفت سے آزادی دلا کر محبوب حقیقی تک پہنچانے کا ذریعہ ثابت ہوتا ہے۔ اس لئے روح اور دل کا اضطراب اس اعتبار سے فرد کے لئے نعمت ہے۔ یہ اضطراب ہی اسے ذکر وعبادت کے ذریعہ محبوب کی راہ پر مستقل مزاجی سے چلنے پر اکساتا ہے۔ اس لئے اس اضطراب کی قدر کرنی چاہئے، نہ کہ اسے سستی اور محبوب سے دوری کا ذریعہ بنانا چاہئے۔

ذکر، بندہ مومن کی ایسی ناگزیر ضرورت ہے کہ اس کے بغیر اس کی زندگی کی کوئی کل درست نہیں ہوسکتی، ذکر کی مطلوبہ تعداد میں خوراک کے بغیر اسے زندگی کے بنے بنائے معاملات بگڑتے ہوئے نظر آتے ہیں، وہ جس چیز میں بھی ہاتھ ڈالے گا، اس میں خیر کے بجائے بگاڑ واقع ہوگا۔ اشتعال، چڑچڑاپن، آپے سے باہر ہوجانا، زندگی سے بے زاری کی کیفیات، ہر معاملہ کے منفی پہلو کا غالب آنا، نیکی کی راہ میں ہمت وحوصلہ کا فقدان، تکبر اور احساس کمتری واحساس برتری خودنمائی جیسی ساری چیزیں ذکر وصحبت سے محرومی کا نتیجہ ہی ہوتی ہیں۔ ذکر کی بجائے مادی کوششوں اور زمانہ سازی کے ذریعہ بگڑے ہوئے معاملات کے حل کی کوششیں یا تو عارضی ثابت ہوں گی یا پھر وہ ناکافی سے دوچار ہوں گی۔

یاد رکھنا چاہئے کہ انسان کے اندر بے تابی کی ایسی آگ رکھی گئی ہے کہ اگر ذکر وفکر اور مخلصانہ عبادت کے ذریعہ اسے بجھاتے رہنے کی راہ اختیار نہ کی گئی تو فرد وافراد کا دل اس آگ میں جلتا رہے گا، جس کے نتیجہ میں زندگی عذاب بن جائے گی۔اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ ذکر وفکر اور مخلصانہ عبادت سے محرومی کے نتیجہ میں فرد کی حیثیت اس شخص کی سی ہوجاتی ہے، جو آگ کی شدید تپش اور جلن کا شکار ہوجائے، وہ سراپا دکھ،غم اور اذیت سے سرشار ہوجاتا ہے۔

اے غافل انسان، جس ہستی نے تجھے وجود بخشا ہے، جس نے تجھے روزی عطا کی ہوئی ہے تو چوبیس گھنٹوں میں دل کی گہرائیوں سے اس کے ذکر کے لئے ایک گھنٹہ بھی نہیں نکال سکتا اور اس کے لئے مختلف بہانے بناتا ہے، یہ بہانے مادی مصروفیات کے سلسلہ میں کہاں چلے جاتے ہیں یعنی دنیا بھر کے کاموں اور مصروفیات کے لئے وقت حاصل ہے، اگر وقت نہیں ہے تو محبوب کے ساتھ مصروفیت کے لئے وقت نہیں، اس سے بڑھکر محبوب حقیقی (جو اس کی سب سے بڑھکر محسن ہستی ہے) اس کی بے قدری اور کیا ہوسکتی ہے۔ حالانکہ اسباب کی ہستی وہی ذات ہے، اس ذات سے ذکر وفکر کے ذریعہ تعلقات کے نتیجہ میں وہ اسباب کو خود ہی سازگار بنا لیتی ہے، یہ وہ اہم بات ہے جو اغوائے شیطانی کے نتیجہ میں سلب کر لی جاتی ہے۔

یاد رکھیں، ذکر سے محرومی اپنے ساتھ سینکڑوں مسائل ومصائب لاتی ہے، جس میں ہمت وحوصلہ کا فقداں، غفلت وکاہلی کا غلبہ، فکری انتشار، اللہ کی بجائے بندوں کی رضا جوئی سے مسائل کے حل کی نفسیات، اپنے معاملات کے بگاڑ میں دوسروں کو مورد الزام ٹھہرانا، ہمہ وقت دنیا کے مستقبل کی فکر کا لاحق ہونا۔ موہوم خیالات کی وجہ سے دوسروں سے شکوک وشبہات میں مبتلا ہونا، افراد سے کام لینے اور ان کی دل جوئی وخوش دلی کی صلاحیت سے محروم ہونا، دل اور زبان پر کنٹرول کا نہ ہونا۔ دوست احباب عزیز واقارب سے بدگمانی کا ہونا، یاس کی کیفیت کا غالب ہونا، بحران سے نکلنے کے لئے مادی وسائل کو حرف آخر سمجھنا اور نئی نئی مادی تدبیروں سے کام لیتے رہنے پر اکتفا کرنا وغیرہ یہ ساری چیزیں ایسی ہیں جو دل کی، ذکر سے محرومی کا نتیجہ ہیں۔ دل وروح کو جب اس کی حقیقی غذا ملنے لگتی ہے تو وہ توانائی سے سرشار ہوجاتے ہیں، وہ یہ توانائی سارے اعضا کو منتقل کرتے رہتے ہیں، جس سے فرد جملہ مصائب سے نجات پاکر حوصلہ وہمت سے زندگی کے مسائل سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت سے بہرہ ور ہوجاتا ہے اس وقت فرد کو احساس ہوتا ہے کہ میں جن مسائل ومصائب کی شدت سے دبا جارہا تھا، وہ تو ذکر سے محرومی کے نتیجہ میں پیدا ہونے والا تاریک احساس تھا، اور احساس کی پاکیزگی کی وجہ سے سارے مسائل کی احساس شدت ختم ہوگئی اور مسائل، مسائل باقی نہ رہے۔

ذکر سے محرومی سے روش ہی ایسی چیز ہے جو فرد کو زندگی کے دوراہے پر کھڑا کر دیتی ہے جس سے وہ زندگی بھر نئے نئے بحرانوں میں مبتلا ہوتا رہتا ہے، اور اس کے تفکرات ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتے اور اس کے لئے زندگی انگاروں پر لیٹنے کے برابر ہوجاتی ہے۔

اہل اللہ، جو اللہ کی محبت کے رازدان اور اس کے ذکر کا ذخیرہ جمع کئے ہوئے ہوتے ہیں، ان کی صحبت ہی ایسی چیز ہے، جس سے فرد کو ذکر کی مسلسل یاد دہانی بھی ہوتی رہتی ہے تو ساتھ ساتھ ذکر کے لئے ہمت وحوصلہ بھی پیدا ہوتا رہتا ہے۔

۳۔ انسانی نفسیات اور نفساتی بیماریوں کے بارے میں ماہرین کے تجربہ پر تبصرہ

نفسیاتی بیماریوں کے بارے میں جدید نفسیات کا کہنا یہ ہے کہ اس کا سبب بچپن کے احساسات وجذبات ہیں۔ بچپن میں جو غیرفطری احساسات وجذبات لاشعور میں جمع ہوتے رہتے ہیں، ان کے بروقت تدارک نہ ہونے کی وجہ سے آگے چل کر، یہ سارے احساسات نفسیاتی وجسمانی بیماریوں کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔

جدید نفسیات، تحلیل نفسی کے ذریعہ ان احساسات کے ازالہ کا طریقہ اختیار کرتی ہے۔ یعنی لاشعور میں چھپے ہوئے جذبات کو شعور کی سطح پر لانا، پھر ان منفی جذبات کو مثبت جذبات کی صورت دینا۔

مثلا فرد میں خوف کا احساس غالب ہے تو مریض کو گفتگو کے ذریعہ یہ باور کرایا جاتا ہے کہ خوف ایسی چیز نہیں ہے، جس سے ڈرا جائے۔ اس کا مقابلہ کرنا چاہئے یا مثلا فرد کو اندھیرے میں بیٹھنے سے خوف لاحق ہے تو اسے آہستہ آہستہ روشنی سے روشناس کرایا

جاتا ہے، اس کی ہمت افزائی کرکے، اس میں اندھیرے سے مقابلہ کی قوت پیدا کی جاتی ہے۔ اس طرح خوف کا احساس اور دباؤ شعور سے کم ہوجاتا ہے۔ جدید نفسیات اس طرح کی چھوٹی چھوٹی نفسیاتی بیماریوں میں یہی کوشش کرتی ہے کہ فرد وافراد کے غیرفطری رویہ کو کسی حد تک صحتمند بنایا جائے۔

جدید نفسیات میں منفی احساسات کو مثبت احساسات میں بدلنے کا دوسرا طریقہ ہپنا ٹائیز کا ہے، جس سے خیالی قوت کے ذریعہ مریض کی خیالی قوت پر اثر انداز ہوکر، اسے مرض سے نجات دلانے کی کاوش ہوتی ہے۔ لیکن ہپناٹائیز کا یہ عمل زیادہ کارگر ثابت نہیں ہو سکا ہے، اس لئے کہ اس سے وقتی طور پر تو مریض کے احساس میں بہتری پیدا ہوجاتی ہے، دوچار دن یا دوچار ہفتوں کے بعد مرض نئے سرے سے پوری شدت سے حملہ آور ہونے لگتا ہے۔ سبب یہ ہے کہ مادی خیالی قوت سے وقتی طور پر شعور سے دباؤ تو کم ہوجاتا ہے، لیکن لاشعور میں موجود احساس کو ختم کرنے میں کامیابی حاصل نہیں ہوتی۔ حقیقت یہ ہے کہ تحت الشعور میں موجود ہیجان خیز جذبات واحساسات کی بہتر اور مکمل تسکین کی صلاحیت مادی نوعیت کے ماہرین کے بس کی بات ہی نہیں۔

اہل اللہ کا کہنا یہ ہے کہ ساری نفسیاتی بیماریاں انسان کے لاشعور میں موجود طاقتوں کی نوعیت کو نہ سمجھنے کی وجہ سے پیدا ہوئی ہیں۔ انسان کا لاشعور جسے تصوف کی اصطلاح میں باطن کہتے ہیں، باطن کی یہ دنیا اتنی وسیع اور لامحدود ہے کہ بڑے بڑے اہل اللہ کے علاوہ دوسروں کے لئے اس سے بڑی حد تک آشنا ہونا ممکن نہیں۔

باطن کو سمندر سے تشبیہ دی جا سکتی ہے، جہاں ایک طرف بڑے بڑے مگرمچھ بھی رہتے ہیں تو موتی وجواہر بھی موجود ہیں۔ لیکن موتیوں وجواہر تک پہنچنے کے لئے مگرمچھوں سے گذرے بغیر چارہ کار نہیں ہوتا۔

لاشعور یعنی باطن کی گہرائیوں میں رحمانی قوتیں بھی موجود ہیں تو شیطانی قوتیں بھی۔ **فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا .**

اگر انسان کی صحیح خطوط پر تعلیم وتربیت کا نظام متشکل ہو تو لاشعور (جو پاکیزہ محبت اور منفی نوعیت کی محبت دونوں قسم کے جذبات سے بھرا ہوا ہے) اس پر منفی قوتیں مغلوب ہو کر، رحمانی قوتیں غالب ہوجائیں اور فرد وافراد کے سارے جذبات واحساسات کی تسکین کی بہتر صورت پیدا ہوجائے، انسانی شخصیت میں موجود ڈر، خوف، احساس کمتری، خوداعتمادی کا بحران، مایوسی کا غلبہ، افراد پر بے اعتمادی، احساس بے بسی، احساس تنہائی وغیرہ ان ساری بیماریوں کی جڑ بنیاد یہی ہے کہ لاشعور یعنی باطن کی گہرائیوں میں پاکیزہ محبت کے جذبات کے اظہار اور اس کے مظاہر کی راہ میں طاقتور منفی قوتیں حائل ہوگئی ہیں اور ان پاکیزہ احساسات وجذبات کو تسکین کے مواقع نہیں مل رہے ہیں۔

انسانی فطرت میں اپنے خالق اور محبوب حقیقی سے محبت کا لازوال داعیہ بڑی قوت اور جوش خروش کے ساتھ موجزن ہے، انسان میں موجود خودشعور ہستی یعنی روح نے ایک بار محبوب حقیقی کا مشاہدہ کیا ہے۔ روح، اب اسی طرح کے مشاہدہ کے لئے مضطرب ہے۔ لیکن نفسی قوتیں جو مادہ کی پیداوار ہیں، وہ فرد وافراد کو مادیت کی طوفان خیز لہروں سے اوپر اٹھکر، فطرت کی بلندیوں کی طرف جانے کی راہ میں شدید حائل ہیں۔ یہی وہ کشمکش ہے، جو انسانی زندگی میں درپیش رہتی ہے۔ افراد کو اس کا شعور ہو یا نہ ہو، لیکن لاشعور یعنی باطن میں رحمانی اور شیطانی قوتوں دونوں کے درمیاں شدید تصادم جاری رہتا ہے۔ قرآن شریف میں ہے کہ ''یہ کافر جب سمندر میں کشتیوں میں سفر کے دوراں طوفانی لہروں کا شکار ہوتے ہیں تو وہ یکسو ہوکر اللہ کو پکارتے ہیں۔ اللہ انہیں نجات دیتا ہے تو باہر آکر وہ پھر اللہ سے باغی ہوجاتے ہیں۔''

اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ بداعمالیوں کی وجہ سے فطرت، مسخ ہونے کے باوجود اس میں اپنے خالق اور محبوب حقیقی کی معرفت کے کچھ نہ کچھ اجزاء موجود رہتے ہیں اور وہ انتہائی مشکل وقت میں ظاہر ہوتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ محبوب حقیقی سے محبت کا داعیہ وتقاضا انسانی فطرت کا سب سے طاقتور تقاضا ہے، یہ روح اور وجدان کی ایسی ناگزیر ضرورت ہے کہ اس کے بغیر انسانی شخصیت نہ صرف یہ کہ نامکمل رہتی ہے، بلکہ وہ ہزارہا صدموں اور بے پناہ نفسیاتی بیماریوں کی شکار ہوجاتی ہے۔ فرد میں پاکیزہ محبت کا یہ تقاضا اتنا طاقتور ہے کہ فرد، جنسی جذبات کی تسکین کے بغیر تو زندہ رہ سکتا ہے، روٹی کے بغیر بھی چند ہفتے یا چند ماہ زندہ رہ سکتا ہے، لیکن محبوب حقیقی سے محبت کے اظہار کے بغیر اس کی زندگی دشوار تر ہے۔ اس کے نتیجہ میں وہ جتنے بھی نفسیاتی امراض کا شکار ہوجائے، کم ہے۔

جدید نفسیاتی ماہرین کا بڑا المیہ یہ ہے کہ وہ لاشعور میں موجود محبوب حقیقی سے محبت کے والہانہ و بے پناہ جذبات کی قوت کے منکر ہیں اور وہ لاشعور میں موجود محبت کے پاکیزہ طاقتور جذبات واحساسات کی نوعیت کو سمجھنے اور اس کی تسکین کی صورت پیدا کرنے سے غافل ہیں۔ انہیں لاشعور میں موجود محض منفی جذبات کے طوفان نظر آتے ہیں اور مادی چیزوں کے ذریعہ ہی انہیں ان جذبات کی روک تھام کی صورت نظر آتی ہے، وہ اس سے بلند ہوکر سوچنے کے لئے تیار نہیں۔

۴۔ ذہنی دباؤ سے بچنے کی موثر صورتیں

عزیزم ڈاکٹر اسلم سعید صاحب ہمارے مخلص دوست ہیں۔ شریف النفس اور منکسر المزاج شخصیت ہیں، ڈاکٹر عرفان الکریم انصاریؒ کے تربیت یافتہ ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ آج کل میرے پاس ذہنی اور نفسیاتی نوعیت کے مریض کافی آرہے ہیں۔ ان کی حالت دیکھکر دل دکھی ہوجاتا ہے، ان کے لئے آپ ایک مختصر تحریر لکھ دیں۔ ان کے ایما پر یہ ایک مختصر مضمون لکھا ہے۔ **(محمد موسیٰ بھٹو)**

آج کل ڈپریشن، مایوسی، زندگی سے بیزاری، دل کے ہر چیز سے اچاٹ ہوجانے کی بیماریاں بہت زیادہ بڑھ گئی ہیں، جس کی وجہ سے لوگوں کی زندگی وبال ہوگئی ہے۔

ڈپریشن اگرچہ بظاہر معاشی ومعاشرتی، گھر و لی وغیرہ حالات کی خرابی کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے، لیکن درحقیقت اس کا بنیادی سبب احساس کی خرابی اور احساس کا بگاڑ ہوتا ہے، جب فرد کا احساس خراب ہوجائے تو اس احساس کو پاکیزہ کرنے کے لئے دوائیں کام نہیں دے سکتی، یہ احساس دراصل روح کو اس کی غذا نہ دینے کی وجہ سے خراب ہوجاتا ہے، روح کیا ہے؟ ہم سب جانتے ہیں کہ روح اللہ کا امر ہے، یہ لطیف ترین قوت ہے، جو انسانی شخصیت اور جسم کو زندہ رکھے ہوئی ہے، روح جب جسم سے نکل جاتی ہے تو انسان لاش بن جاتا ہے، روح کی حقیقت یہ ہے کہ اس نے عالم امر میں اللہ کو دیکھا ہے، یہاں آکر وہ رو رہی ہے، روح کی اصل غذا تو اللہ کا مشاہدہ ہی ہے، جو دنیا میں ممکن نہیں، لیکن دنیا میں اللہ کا ذکر ایسی چیز ہے جس سے روح کو اللہ کے انوار ملتے ہیں، جس سے روح کو غیر معمولی خوشی ولذت حاصل ہوتی ہے، اور روح کی لذت سے احساس میں پاکیزگی پیدا ہوجاتی ہے۔

یاد رکھیں کہ روح کی غذا اللہ کا ذکر ہی ہے، جب روح کو ذکر کی یہ غذا نہیں ملتی تو روح مشتعل ہوکر، ذہن، دل اور نفسیات کی طرف اپنا یہ اشتعال منتقل کرتی ہے، جس سے ذہنی دباؤ، ڈپریشن، مایوسی، گھبراہٹ، زندگی سے بیزاری اور دوسرے ذہنی امراض پیدا ہوتے ہیں۔

اگر آپ چاہتے ہیں کہ ہر طرح کے ڈپریشن سے بچاؤ کی صورت پیدا ہو اور آپ کے مزاج اور نفسیات میں اعتدال اور سیرت پاکیزہ ہو اور آپ اپنے لئے اور اپنے گھر والوں کے لئے باعث رحمت ثابت ہوں تو روزانہ صبح وشام کم از کم دس پندرہ منٹ کا اللہ کے نام کا ذکر ضرور شروع کردیں۔ اللہ کے اس نام کے ذکر کی برکت سے انشاء اللہ آپ کا آہستہ آہستہ ہر طرح کا ڈپریشن ختم ہونا شروع ہوجائے گا، ہمارے ہاں صدیوں سے ہمارے بزرگوں میں اس ذکر کی فضا موجود رہی ہے، جس کی وجہ سے ہمارے آباؤ اجداد بہترین زندگی گذارنے میں کامیاب ہوئے۔ اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ (یاد رکھو کہ اللہ کے ذکر سے ہی دلوں کو سکون حاصل ہوتا ہے۔)

ہمارے ہاں ڈپریشن کی جو بڑھتی ہوئی وبا آئی ہے، یہ مغرب سے ہی آئی ہے، مغرب نے دین ومذھب اور خدا کا انکار اور بغاوت اختیار کرکے، مادیت پرستی والی زندگی کو مقصود بنایا ہے، اس کی وجہ سے مغرب میں ذہنی دباؤ اور نفسیاتی بیماریاں وبا کی طرح پھیل چکی ہیں، اس لئے وہاں ہر محلّہ میں نفسیاتی ڈاکٹروں کا خاص اہتمام موجود ہے، ہم نے اہل مغرب کی تقلید اختیار کرکے خدا، دین ومذھب سے دوری اختیار کی ہے، اس کی وجہ سے دل اور روح کی پیاس بہت بڑھ گئی ہے اور بے سکونی اور بے یقینی کی فضا پیدا ہوگئی ہے، مادیت پرستی کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی ساری ذہنی، نفسیاتی، اعصابی، وجدانی اور

اخلاقی بیماریوں سے بچاؤ کی تین صورتیں ہیں۔

ایک یہ کہ آپ اپنا دوستی کا ماحول تبدیل کریں، نیک، صالح او ر اسلامی اعتبار سے سکون وخوشی سے زندگی گذارنے والے افراد سے تعلقات بڑھائیں۔دوسری صورت یہ ہے آپ استغفار، درود شریف اور تیسرے کلمہ کا کثرت سے ذکر یں، روزانہ کم ازکم چار پانچ سو مرتبہ۔تیسری صورت اور اور سب سے بہتر صورت یہ ہے کہ آپ اللہ کے اسم ذات کا ذکر شروع کردیں، جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔

اہل مغرب، جس نے خدا اور مذھب کومسترد کرنے کے بعدزندگی میں بہت زیادہ دکھ، اذیتیں اور ڈپریشن کے عذاب برداشت کئے ہیں، اس مغرب کے ماہرینِ نفسیات بڑی تحقیق کے بعد اب مادی نوعیت کے مراقبہ کی طرف آئے ہیں، وہاں مراقبہ کی یونیورسٹیاں قائم ہیں اور بڑی بڑی کمپنیوں اور کارپوریشنوں میں مادی نوعیت کے مراقبے ہونے لگے ہیں، جس سے ذہنی دباؤ میں کمی آنے لگی ہے، آپ نیٹ کا میڈیٹیشن کا حصہ کھول کردیکھیں، اس میں اس کی تفصیل موجود ہے،لیکن مادی مراقبہ خیالی انتشار کوکم تو کر سکتا ہے۔قلبی سکون نہیں دے سکتا ،ہمارا مراقبہ اللہ کے اسم ذات کا مراقبہ ہے، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غارحرا میں کرتے تھے، اسم ذات کے مراقبہ میں وہ نور، وہ حسن اور وہ توانائی موجود ہے، جو فرد اور افراد کو ساری نفسیاتی، وجدانی، روحانی واخلاقی بیماریوں سے اوپر اٹھا کر انہیں بہتر انسان بنانے کا ذریعہ بنتا ہے۔

بس ہمت وحوصلہ سے کام لینے کی ضرورت ہے، آپ کو دواؤں کی کوئی ضرورت نہیں، اسم ذات کے مراقبہ سے آپ کو از خود شفایابی نصیب ہوگی، بلکہ اس سے آپ ایک نئی پاکیزہ زندگی محسوس کریں گے۔ذکر ومراقبہ کا طریقہ یہ ہے کہ آنکھیں بند کرکے سر جھکا کر، توجہ دل کی طرف ہو کہ میرا دل اللہ اللہ کررہا ہے، دل کی غذا ہی اللہ کا ذکر ہے، دل کو یہ بتانے کی ضرورت ہی نہیں ہے کہ کیا کرنا ہے، مراقبہ کی مشق سے جب دل اپنی اصل غذا سے آشنا ہوگا تو دل اس ذکر پر ٹوٹ پڑے گا اور اس ذکر ومراقبہ سے نہ صرف جملہ نفسیاتی بیماریوں سے نجات ملے گی، بلکہ فرد انسانی جوہروں سے بھی بہرہ ور ہوگا، شروع میں خیال نہیں جمے گا،لیکن چند دنوں تک کرتے رہنے سے انشاءاللہ ذکر کے اثرات محسوس ہوں گے۔

حدیث قدسی میں فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں کائنات کی کسی چیز میں نہیں سما سکتا ،سوائے بندہ مؤمن کے دل میں۔

آپ یہ ذکر شروع کردیں، اور روزانہ صبح شام دس پندرہ منٹ تک کریں، انشاء اللہ ساری ذہنی اور نفسیاتی بیماریاں حیرت انگیز طور پر ختم ہوجائیں گی، اگر شروع میں خیال نہ جمے یا وسوسے آنا شروع ہوجائیں تو اس کا خیال نہ کریں، ہرصورت میں آپ مراقبہ کے لئے بیٹھ جائیں۔

ذہن میں یہ نکتہ ضرور پیش نظر رکھیں کہ اللہ کے ذکر اور مراقبہ سے ڈپریشن اور ذہنی دباؤ سے بچاؤ جیسے سارے ثمرات وفوائد جو آپ کو حاصل ہوگے، وہ تو ہوں گے ہی۔لیکن سب سے بڑا فائدہ جو آپ کو حاصل ہوگا، وہ یہ کہ آپ اللہ کی محبت کی حلاوت سے فیضیاب ہوں گے۔ اللہ سے قربت کے مقامات طے کریں گے، اللہ کی محبت کی وجہ سے اسلامی شریعت آپ کے مزاج کا حصہ بنتی جائے گی اور آپ اس حدیث شریف کے مصداق ہوں گے کہ جو اللہ کا ہوجاتا ہے، اللہ اس کا ہوجاتا ہے۔

کتنی بڑی فتحیابی اور کامیابی ہے، جو اللہ کے (کثرت) ذکر سے آپ کو حاصل ہوگی۔

اپنے علاقہ اور محلّہ میں اگر معلومات کریں گے تو آپ کو ایسے افراد ضرور مل جائیں گے، جو اللہ کے ذکر کے حلقوں سے جڑے ہوئے ہوں گے۔ بس ان افراد کے ذریعہ ذکر کے ان حلقوں سے وابستہ ہوجائیں، انشاء اللہ ڈپریشن کے علاج کے ساتھ ساتھ آپ کے لئے اسلامی شریعت پرعمل پیرا ہونا بھی آسان ہوجائے گا۔

سالک کے حالات

(راہ سلوک میں چلنے والوں کے لئے)

سالک جب ذکر وفکر کی دنیا میں داخل ہوتا ہے تو باطن کی وسیع تر دنیا میں رحمانی اور شیطانی ونفسانی قوتوں کے درمیاں شدید ٹکراؤ شروع ہوجاتا ہے۔ اس ٹکراء میں کبھی شیطانی قوتیں غلبہ پاجاتی ہیں، کبھی رحمانی قوتیں۔ اپنے ہیچ اور سیاہ کار ہونے کا شدید ترین احساس کا ہونا، کبھی گناہ صغیرہ کو بھی گناہ کبیرہ کی حیثیت سے تصور کرنا، ادلتی بدلتی کیفیات کا ہونا، دل کا دنیا سے اچاٹ ہوجانا، دنیاوی کاموں کو بجبر سرانجام دینا، دنیا دار افراد سے تعلقات وروابط میں اذیت محسوس کرنا، غیرضروری چیزوں میں مشغولیت سے تکلیف محسوس کرنا، کبھی حالت غم کا ہونا، کبھی غیرمعمولی مسرت کا ہونا، کبھی دل میں ذکر کی غیرمعمولی چاہت کا ہونا، کبھی ساری کوششوں کے باوجود دل میں آمادگیٔ ذکر کا نہ ہونا، کبھی اپنے آپ کو بڑا سمجھنے کے احساس کا غالب ہونا اور دوسروں کی تحقیر کے خیالات کا پیدا ہونا، کبھی معمولی سی معمولی بات پر مشتعل ہونا، کبھی مزاج کے خلاف بڑے سے بڑے واقعہ اور نقصان کے باوجود خوشی کا غالب ہونا، کبھی نگاہوں کی ازخود حفاظت کی صورت کا پیدا ہونا، کبھی نگاہوں کی حفاظت میں ناکام ہونا، کبھی نماز کے لئے دل کا آمادہ ہونا اور کبھی نماز کے لئے نفسی قوتوں کی طرف سے شدید مزاحمت کا ہونا، کبھی دوست واحباب واہل وعیال کی سخت سے سخت باتوں کے رنج وغم کا کوئی احساس نہ ہونا، کبھی ان باتوں سے شدید مشتعل وبے قابو ہونا، وغیرہ یہ سارے حالات راہ سلوک کا حصہ ہیں اور نفسی اور رحمانی قوتوں کے ٹکراء کا نتیجہ ہیں۔

طالب کو رنج وغم اور قبض وبے چینی کے ہر موڑ پر اس بات کا استحضار کرنا چاہئے کہ محبوب حقیقی نے اس کے لئے راہ محبت وراہ معرفت کا دروازہ کھول کر، اس پر فضل عظیم فرمایا ہے، بلکہ اسے دین ودنیا کی جملہ سعادتوں سے بہرہ ور فرمایا ہے۔ یہ سعادت ہزار لوگوں میں سے کسی خوش نصیب فرد ہی کو عطا ہوتی ہے، یقیناً محبوب کو طالب کی کوئی ادا پسند آئی ہے، جس کی وجہ سے مادہ پرستی کے سمندر میں ڈبکیاں کھانے والے حالات میں اس نے اس پر اپنا فیضان فرمایا ہے اور اسے نفس کو مہذب بنانے کی راہ پر گامزن کیا ہے۔ اصلاح نفس کی راہ میں حائل دشواریوں سے خوف زدہ ہوکر، راہ فرار اختیار کرنے کے خیالات کا غلبہ، یہ دراصل محبوب کے انعام عظیم کی ناقدری شمار ہوگی۔

اگرچہ یہ حالات بظاہر سالک کے لئے بہت بڑا امتحان ہوتا ہے، اس کے لئے ایک ایک لمحہ قیامت خیز ہوتا ہے، لیکن یہ قیامت خیز حالات واحساسات ہی اس بات کی علامت ہیں کہ سالک کا سفر جاری ہے اور وہ سعادت دارین کی راہ پر گامزن ہے۔

راہ عشق دراصل نام ہی محبوب سے وصال کے لئے مصائب کی زندگی اختیار کرنے کی ہے۔

ایک بزرگ مولانا فخر الدین عراقی فرماتے ہیں۔

بہ عالم ہر کجا رنج وملامت
بہم ہر رند عشقش نام کرند

(جہاں میں جہاں جہاں رنج وملامت موجود تھے، ان سب کو یکجا کرکے ان کا نام عشق رکھدیا گیا)۔

سالک کو ذکر میں وقفہ سے بچنا چاہئے۔ صحبت کا مسلسل اہتمام کرنا چاہئے، اگر ذکر اور صحبت کا تسلسل قائم ہے تو اسے بڑے سے بڑا خوف وحزن بھی کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ جس طرح مردہ غسالوں کے ہاتھ میں ہوجاتا ہے، وہ اس کے ساتھ جو کچھ کرتے ہیں، وہ چوں چرا کرنے سے قاصر ہوتا ہے، یہی حالت سالک راہ طریقت کی ہونی چاہئے، کہ اپنے آپ کو مکمل طور پر محبوب حقیقی کے حوالے کرنا چاہئے۔ وہ اس کے حسب حال جو باطنی کیفیت اور جو حالات اس کے لئے مناسب، مفید اور بہتر سمجھے گا، وہ اس پر طاری فرماتا رہے گا۔

طالب کو اس بات کا ہر وقت دھیان رکھنا چاہئے کہ وہ نفس کی گہرائیوں میں موجود نفس پرستی کے انگاروں کو بجھانے کی راہ پر گامزن ہے، جب تک نفس کے یہ انگارے اخلاقی رزائل اور بداطواری کی صورت میں شعلہ زن ہیں، تب تک طالب کو آرام، سکھ اور طمانیت کی نیند سونا اور ذکر وفکر سے بے نیازی کی روش کا ہونا، اس کے لئے روا نہیں۔

مبتدی ومتوسط طالب نفس کشی کی دشوار گذار مشکلات کو نہ جاننے یا اس کا احاطہ نہ کرنے کی وجہ سے غم زدہ رہتا ہے کہ نہ معلوم وہ راہ سلوک میں چل بھی رہا ہے یا نہیں، اس کی اصلاحِ نفس کی صورت پیدا بھی ہورہی ہے یا نہیں، کہیں اس کا سفر رک تو نہیں گیا ہے یا ایسا تو نہیں ہے کہ وہ راندہ درگاہ ہوگیا ہے۔ مبتدی ومتوسط طالب اس طرح کے احساسات میں گھرا رہتا ہے، جو بعض اوقات طالب کو یاس (مایوسی) کی طرف لے جاتے ہیں، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ کیفیات کے ادلنے بدلنے کے یہ حالات، راہ سلوک کا بنیادی حصہ ہیں، بڑے بڑے اہل اللہ کو انہی حالات سے گذرنا پڑا ہے، آج جو اولیائے کرام ہمارے لئے قابل فخر ہیں، جن کا ذکر ہم کتابوں میں پڑھتے ہیں، وہ سب اضطراب کے انگاروں سے گذر کر ہی اس مقام پر فائز ہوئے ہیں۔

سالک کی تربیت کے لئے اس کے ساتھ خاص معاملہ کیا جاتا ہے۔ ایک طرف تو اس پر وقفہ وقفہ کے ساتھ خوف وحزن اور ہیبت طاری کردی جاتی ہے، تاکہ اس کے قلب میں حسن کے نئے احساسات کے تحمل کی صلاحیت ابھر سکے، دوسری طرف سالک کے لئے ابتدا میں کافی عرصہ تک غیرضروری میل جول اور معاشی خوشحالی کے لئے زیادہ توانائیاں صرف کرنے کے راستے مسدود کر دیئے جاتے ہیں۔

اگر وہ غیرضروری میل جول میں وقت صرف کرے گا یا معاشی جدوجہد کے لئے ضرورت سے بہت زیادہ مصروف ہوگا تو اس کے دل کے نظام کو درہم برہم کردیا جاتا ہے، دل میں شدید ترین قبض کی کیفیت کا پیدا ہوجانا، بظاہر سالک کے لئے ناقابل برداشت اذیت اور دکھ کا موجب ہوتا ہے، لیکن بباطن وہ اس کے لئے رحمت ہوتا ہے، اس لئے کہ اس کے ذریعہ سے ایک تو اس کا رشتہ اسباب ووسائل سے منقطع کرکے، محبوب سے استوار کیا جاتا ہے، دوم یہ کہ اس طرح سے اس کے روحانی ارتقاء کے راستے کھول دیئے جاتے ہیں، قبض وبسط کے ذریعہ سالک کو روحانی ارتقاء کے راستے اس طرح طے کرائے جاتے ہیں، کہ اسے اس کا علم اور شعور بھی نہیں ہو پاتا۔ بالکل اس طرح جس طرح بچے کو اپنی عمر کے ساتھ اپنی قدر وقامت اور عمر میں اضافہ کا علم نہیں ہو پاتا۔

سالک کا نفس مطمئنہ کا سفر قبض واضطراب کے ذریعہ جلد طے ہونا شروع ہوتا ہے، اس لئے کہ ذکر میں تو لذت ہوتی ہے، جس سے نفس محظوظ ہوتا ہے، لیکن خوف وحزن کی کیفیات میں سالک سے اس کی ساری لذتیں اور باطنی کیفیات چھن جاتی ہیں، وہ اپنے آپ کو زندگی کی شاہراہ پر یک وتنہا اس طرح پڑا ہوا محسوس کرتا ہے کہ گویا اس سے سب کچھ چھن گیا ہے اور وہ دنیا میں سب سے زیادہ قابل رحم حالت میں ہوتا ہے۔ اسے مال اسباب، جائیداد اور اہل وعیال کے ضیاع سے وہ اذیت نہیں ہوتی، جو قبض کی خاص حالت سے ہوتی ہے۔

جو نکتہ سب سے زیادہ اہم ہے، جسے سمجھنا ضروری ہے، وہ یہ ہے کہ قبض اور خوف وحزن کی واردات کے ذریعہ سالک کے نفس کا اس طرح تزکیہ کیا جاتا ہے کہ اس کے اندر کا سارا گند نکال دیا جاتا ہے۔ نفس کی خاصیت دراصل جہنم کے انگاروں سے مشابہت رکھتی ہے۔ ذکر وفکر، صحبت اور قبض کے ذریعہ جوں جوں نفس کا تزکیہ ہونے لگتا ہے، اسی مناسبت سے سالک کو جہنم کے انگاروں (جو نفس کی بہیمت کی صورت میں اس کے داخل میں یعنی نفس کی گہرائیوں میں موجود ہوتے ہیں) اسے نجات ملنا شروع ہوجاتی ہے۔ قبض کی ہولناک واردات کی صورت میں سالک کو جو غیرمعمولی اذیت اور تکلیف ہوتی ہے، وہ دراصل نفس کی ان بہیمانہ خاصیتوں کے اخراج اور جہنمی انگاروں کے بجھ جانے کی وجہ سے ہوتی ہے۔ جس کی تپش اور گرمائش سے سالک کا دل ودماغ تھوڑی دیر کے لئے معطل سا ہوجاتا ہے اور وہ اذیت کے پہاڑ محسوس کرنے لگتا ہے۔ وہ جو فرمایا گیا ہے کہ اس دنیا میں نفس کا تزکیہ نہ ہونے کی وجہ سے نفس کی خرابیاں جب کردار بدصورت میں ظاہر ہوتی ہیں تو ایسے افراد کا تزکیہ آخرت میں جہنم کی آگ سے کیا جائے گا۔

آگ سے تزکیہ اور آلائشوں سے پاک ہونے کے بعد ایمان کی صورت میں اسے جہنم سے نکال کر جنت میں داخل کیا جائے گا۔ سالکِ راہ حق کے نفس کا تزکیہ دراصل اس دنیا میں ہی ہونا شروع ہوجاتا ہے اور خوف وحزن کی صورت میں وہ تزکیے کے ان اثرات کے جہنمی انگاروں کو دہشت کی صورت میں محسوس بھی کرتا ہے۔

سالک پر جب بســـط کی کیفیت طاری ہوتی ہے (جو ابتدا میں وقفہ وقفہ سے ہوتی ہے، آخر میں مستقل طور پر ہوتی ہے) تو اس کا دل خوشی سے اس طرح لبریز ہوجاتا ہے، گویا اسے دین ودنیا کی جملہ سعادتوں سے نوازا گیا ہے۔ یہ خوشی دراصل جنتی زندگی کا عکس ہوتی ہے، جو انوار الٰہی کے ورود سے سالک کو مشاہد ہوتی ہے۔ جسے قرآن میں حیاۃ طیبہ

سے بیان کیا گیا ہے۔ اس لئے فرمایا گیا ہے کہ مومن کے لئے جنتی زندگی اس دنیا سے ہی شروع ہے، آخرت میں اس کی تکمیل ہوگی۔ اسی طرح کافر کے لئے بھی جہنمی زندگی اسی دنیا سے شروع ہوجاتی ہے۔ آخرت میں اس کی تکمیلی صورت میں ظاہر ہوگی۔

اس دنیا میں سالک کو آخر میں سب سے بڑی کامیابی جو حاصل ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ وہ خوف سے مامون ومحفوظ ہوجاتا ہے اور خوف کی زندگی سے اوپر اٹھ جاتا ہے۔ خوف کیا ہے؟ فرد پر اکثر اوقات دنیا کی ہیبت کے بارے میں مایوسی کے جو احساسات غالب ہوتے ہیں، خوف انہی احساسات کا نام ہے۔ خوف کی حالت میں فرد کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ میں جو کچھ چاہتا ہوں، مبادا، مجھے وہ کچھ حاصل نہ ہو اور اس کی وجہ سے میری زندگی محرومیوں سے دوچار ہو۔ دنیا میں افراد کی ناکامیوں کی ساری داستان خوف کے احساسات سے ہی وابستہ ہے۔ جب افراد پر خوف کا غلبہ ہوتا ہے تو اس سے مکر، فریب جھوٹ، وعدہ خلافی، خیانت، بدعہدی، رشوت، لوٹ مار، ظلم، استحصال اور قتل جیسے گناہ سرزد ہونے لگتے ہیں، اس لئے کہ خوف کی نفسیات افراد کو مادی مستقبل کی زندگی کو لاحق خطرات سے بچانے کے لئے اس طرح کی حرکات اور جرائم میں پناہ لینے پر مجبور کرتی ہے۔ خوف کی یہ زندگی دراصل جہنمی زندگی کا عکس ہوتی ہے، معاشرہ کا سارا فساد (جس سے اجتماعی زندگی زیرو زبر ہوجاتی ہے) خوف ہی کا نتیجہ ہوتا ہے اور معاشرہ کی اکثریت عام طور پر خوف کی اس بیماری میں مبتلا ہوتی ہے اور خوف کی یہ بیماری ہزاروں صورتوں اور شکلوں میں ظاہر ہوتی ہے، راہ حق کا طالب، صحبت، ذکر وفکر اور مخلصانہ طور پر اطاعتِ رسول کے ذریعہ آہستہ آہستہ خوف کی زندگی سے بلند تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ صحبت اور ذکر وفکر کی ہر نئی خوراک کے ذریعہ اللہ کی محبت کا طالب، جہاں حسن کے نئے جلووں سے فیضیاب ہوتا ہے وہاں اس کے کردار میں بلندی اور علم میں بھی اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ اس طرح صحبت اور ذکر وفکر کا مسلسل تکرار فرد کے حسن کے احساسات کے حقیقی محبوب سے محبت کے رازدان فرد پر اللہ کا ایک بڑا فیضان یہ ہوتا ہے کہ وہ علم کے سمندر میں غوطہ زن ہوکر علم کا وافر ذخیرہ اپنے ساتھ لاتا ہے، جس سے اسے ''فرقان'' کی دولت عظمیٰ حاصل ہوتی ہے، جسے قرآن میں'' یجعل لکم فرقان'' سے بیان فرمایا گیا ہے، علم کے اس سمندر میں غوطہ زنی کا عمل بیک وقت نہیں ہوتا، یہ لگاتار ریاضتوں سے ہوتا ہے۔ لیکن اس عمل کے آغاز سے ہی عاشق کو اس جوہر علم سے کچھ حصہ ملنے لگتا ہے، اس کے نتیجہ میں رضائے الٰہی اس کا مطلوب بن جاتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں عاشق کو محبت ومعرفت کے نتیجہ میں وہ ملکہ حاصل ہوتا ہے، جس سے زندگی کا ہر عمل محبوب کے عین رضا کے مطابق ہونے لگتا ہے۔ اس علم کی کچھ خاصیتیں یہ ہیں۔ مادی حسن سے دستبرداری کی صلاحیت پیدا ہوجاتی ہے، ایسی خوشحال زندگی جو محبوب کی رضا کے برعکس ہو، اس سے تنفر پیدا ہوجاتا ہے۔ استغنا اور فقر کا مزاج راسخ ہونے لگتا ہے، زندگی کے معاملات میں صحیح کیا ہے اور غلط کیا ہے، یہ فراست عطا ہوجاتی ہے۔ افراد کی نفسیات سے آشنائی حاصل ہوجاتی ہے۔ اور واسطیدار افراد کے بے وفایانہ کردار کا پہلے سے اندازہ ہوتا ہے، اس لئے ان کی بے وفائی اور دھوکہ دہی پر اسے زیادہ دکھ نہیں ہوتا۔

ایک اور بات جس کا سالک کو دورانِ سلوک مشاہدہ ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ مصیبت اور اذیت نام ہے محبوب کی عبادت اور اس کے ذکر سے اعراض اور غفلت کا۔ محبوب سے دوری اور جدائی کا احساس (جو ذکر وفکر سے غفلت کا لازمی نتیجہ ہے) غم کے پہاڑ اپنے ساتھ لاتا ہے، مصیبت دراصل عبادت کی پریشانی اور محبوب حقیقی کی یاد کی دبی ہوئی خواہش کا نتیجہ ہوتی ہے۔ جو نفس کی فطرت کا حصہ ہے۔ انسانی فطرت کی مکمل رفیق اور دائمی رفیق کے بغیر کسی صورت میں تسکین نہیں ہوتی ارتقا کا ذریعہ بنتا ہے۔

وہ اپنی تشفی کے لئے پر آں مضطرب اور بے چین ہے، بظاہر مصیبت کا ظاہری سبب چاہے کچھ بھی ہو، لیکن یہ مصیبت کے اظہار کا ذریعہ ہوتا ہے، جب کہ اس کا بنیادی اور حقیقی سبب فطرت میں موجود جذبہ عبادت سے اعراض اور غفلت ہوتا ہے۔ اس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ جوں ہی فرد عبادت اور ذکر وفکر میں پوری توانائی اور خشوع وخضوع کے ساتھ مصروف ہوتا ہے۔ اس سے غم کے بادل چھٹنے لگتے ہیں اور تکلیف، مصیبت اور اذیت کے احساسات کالعدم ہونے لگتے ہیں۔

نفس دوسروں کو آگے بڑھتے

ہوئے دیکھنے کا روادار نہیں

نفس کی مثال کچھوے کی سی ہے کہ کچھوے کو جب بھی ضرب کاری لگائی جائے تو وہ منہ چھپا لیتا ہے، جب کہ اس کی جسمانی صورت ایسی ہے کہ اس کے جسم پر لگائی جانے والی کوئی ضرب اس پر کارگر ثابت نہیں ہوتی۔ البتہ اس کے منہ پر لگنے والی ضرب اسے مارنے کا موجب بن سکتی ہے، لیکن منہ کو چھپانے کی اس میں ایسی مہارت حاصل ہے کہ ہر ضرب کے موقعہ پر وہ بہت فن کاری اور تیزی سے منہ کو چھپا کر ضرب سے بچ جاتا ہے، یہی حال نفس کا ہوتا ہے کہ اس پر کوئی وار کارگر ثابت نہیں ہوتا، سوائے ذکر، عبادت، نیکوکاری وغیرہ کے، لیکن غلط عادتوں، ماحول کے اثرات بد کی وجہ سے ذکر وعبادت اور نیکوکاری کے لئے اس میں نہ صرف یہ کہ طبعی مناسبت موجود نہیں ہوتی، بلکہ وہ نفس پرستی کی آخری حدود پھلانگنے لگتا ہے، رسمی نیکوکار افراد کے نفس کی حالت بھی عام طور پر یہی ہوتی ہے کہ حرص وہوس اور حسد وجلن کے جذبات انہیں بے قابو کردیتے ہیں اور نہیں تو یہ جذبات ان کے دل کو فاسد اور بے چین ضرور کرتے رہتے ہیں۔ مثلاً نفس، سیاست، معیشت، معاشرت اور اجتماعی زندگی میں اپنے ساتھیوں اور جاننے والوں اور معاصر شخصیتوں کو آگے بڑھتے ہوئے، ترقی کرتے ہوئے اور معاشرہ میں اپنا مقام بناتے ہوئے ہرگز دیکھنا نہیں چاہتا، حتیٰ کہ مذہبی دائروں اور دعوتی محاذ پر کام کرنے والے افراد کے نفس کی بھی عام طور پر یہ حالت ہوتی ہے کہ ان کا نفس بزبان حال کہہ رہا ہوتا ہے کہ میرے ہوتے ہوئے دعوتی محاذ پر دوسروں کی پیش قدمی اور لوگوں کا دوسرے داعیوں اور شیوخ کی طرف رجوع یا دوسرے داعیوں اور شیوخ کی، افراد معاشرہ میں مقبولیت، یہ ایسی بات ہے جو میرے لئے تشویش کا موجب ہے، اگرچہ فرد بظاہر اپنے وقار، اپنی داعیانہ حیثیت اور اپنے تقدس کو قائم رکھنے کی خاطر عملی طور پر اس کا اظہار نہ کرسکے اور ایسی شخصیتوں کی مخالفت نہ کرسکے، لیکن اس کا نفس انہیں آگے بڑھتے ہوئے دیکھکر کروٹ ضرور لیتا ہے۔ نفس کی ان خطرناک شرارتوں اور فریب کاریوں کی وجہ سے ہی بزرگوں نے طالبوں کے لئے یہ تجویز کیا ہے کہ وہ عرصہ تک صحبت اور ذکر وفکر کا خصوصی اہتمام کریں اور عرصہ تک لوگوں سے غیرضروری تعلقات کو قطع کریں، نفس کی فریب کاریوں سے بچاؤ کی یہی مؤثر صورت ہے۔